فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۷

ماہ جنوری ۱۹۸۱ء تا جون ۱۹۸۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی	۸۹ - ۹	۶	جناب مولوی شمس تبریز خاں صاحب رفیق مجلس تحقیقات و نشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ	۳۷۶-۳۶۰
۲	جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی،	۱۹۷-۱۲۰	۷	سید صباح الدین عبدالرحمن	۸۲ - ۲ ۱۶۹ - ۱۶۲ ۳۲۲-۲۴۲ ۴۰۸-۳۶۹ ۴۱۵
۳	ڈاکٹر تقی الدین ندوی مستشار علمی دائرۃ القضاء الشرعی استاذ حدیث عین یونیورسٹی، ابوظبی	۳۷-۴			
۴	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی گورنمنٹ کالج لاہور، پاکستان،	۲۹۲-۲۱۷	۸	ضیاء الدین اصلاحی،	۱۵۱، ۷۰-۴۴ ۲۳۰-۱۵۷ ۳۱۷-۲۳۹ ۴۸۱-۴۶۵
۵	جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش،	۱۰۵	۹	جناب حکیم سید ظل الرحمن صاحب صدر شعبۂ علم الادویہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵۳

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۱۲۷

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء تا جون سنہ ۱۹۸۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۷

ماہ جنوری ۱۹۸۱ء تا ماہ جون ۱۹۸۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۲۷ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گذشتہ چودہ سو سال میں اس برصغیر کے مسلمان غداروں کا ذکر معارف کے گذشتہ شمارہ میں آیا تھا، اس میں اس ملک کے دورِ مغلیہ میں جو غدار پیدا ہوئے، ان کا احاطہ نہیں ہو سکا تھا،

بابر نے ہندوستان کی اپنی نوزائیدہ سلطنت اپنے چہیتے فرزند ہمایوں کو دی تھی، یہ خالصۃً اسلامی سلطنت نہ سہی مسلمانوں کی تو تھی، ان کی حمیت اور غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس کو ہر قسم کی نفاق پروری، انتشار پسندی اور غداری کے مضرت رساں پہلو سے محفوظ رکھتے، مگر بابر کی وفات کے بعد ہی اس کے بہنوئی میر محمد مہدی خواجہ، اس کا دمساز وزیر اعظم خلیفہ اور اس کے تین اور لڑکے کامران، عسکری، اور ہندال ہمایوں کے حریف بن کر حکمرانی اور جہانبانی کا خواب دیکھنے لگے، ہمایوں نے اپنے بھائیوں کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کو الگ الگ کچھ علاقے دیے، مگر وہ ان پر قانع نہیں رہے،

ہمایوں کو اپنی حکومت کی خاطر گجرات، سندھ، بنگال اور بہار کے حکمرانوں سے لڑنا پڑا، اس کے بھائیوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا لیکن کامران علی الرغم اپنے نام کا خطبہ پڑھاتا رہا، مرزا عسکری نے اپنی ایک زندانہ مجلس میں یہ مستانہ نعرہ لگایا "میں بادشاہ ہوں، ظل اللہ ہوں"، ہندال نے ہمایوں کی مخالفت میں اسکے ایک بڑے معتمد علیہ بہلول کو قتل کر دیا، ہمایوں نے قنوج میں شیر خاں سے شکست کھائی تو اس نے بھائیوں کو متحد کرنے کی کوشش کی، مگر ان میں سے ہر ایک سلطنت کا مالک بلا شرکت غیرے بننا چاہتا تھا، ہمایوں کی ہمت ساتھ دیتی رہی، شکست کھا کر ہندوستان چھوڑا تو پندرہ برس کے بعد کابل، قندھار اور بدخشاں فتح کرتا ہوا، پھر یہاں واپس آیا، اس نے اپنے بھائیوں کو پھر

قریب تر کرنا چاہا، ہندال تو اس کے سامنے جھکا، مگر کامران اور عسکری اس کے مخالف رہے،

عسکری تو اس کو گرفتار کر کے اس کی بادشاہت کو ختم کرنے کی فکر میں رہا، ایک موقع ایسا بھی آیا کہ کامران کے قبضہ میں کمسن اکبر آگیا تو کابل کے محاصرہ میں جب وہ ہمایوں سے لڑا تو اس نے اکبر کو وہاں بٹھایا جہاں توپ کے گولوں کا مینہ برس رہا تھا، مگر خوش قسمت شہزادہ محفوظ رہا، کامران تو آخر میں ہمایوں کے دشمن سلیم شاہ سوری سے جا ملا، اور جب وہ اپنی قسمت سے سب کھیل کھیل چکا تو فاتح ہمایوں کے پاس لایا گیا، اس نے اس کی غداری کی سزا میں اسکو اندھا کر دیا، جس کے بعد وہ مکہ معظمہ چلا گیا، اور وہیں وفات پائی،

شیر شاہ نے ہمایوں پر فتح پا کر ایک شاندار حکومت قائم کی، مگر افغانوں کی پھوٹ اور غداری کی وجہ سے یہ صرف چھبیس برس قائم رہ سکی، افغان امرا ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار رہتے، انکا عمل اس پر تھا کہ

ملک بمیراث نگیرد کسے تا نہ زند تیغ دو دستی کسے

اس تیغ دو دستی کے ذریعہ سے سپہگری کے اعلیٰ نمونے ضرور دیکھنے میں آئے، مگر اسی کے ذریعہ غداری بھی ہوتی رہی، اسلام شاہ کے بعد اس کا کمسن بیٹا فیروز شاہ تخت پر بٹھایا گیا، تو اس زمانہ کے مسلمانوں کو یہ بھی دیکھنا پڑا کہ اس کے حقیقی ماموں مبارز خاں نے اس کو اپنی بہن کے پہلو سے چھین کر تہ تیغ کیا، اور محمد شاہ المعروف بہ عدلی کے خطاب سے تخت پر بیٹھ گیا، مگر باہمی منافقت کی وجہ سے یہ سلطنت پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی، ان میں تین علاقوں کے حکمراں خانہ جنگی میں مارے گئے،

یہ منظر بھی اس زمانہ کے مسلمانوں نے دیکھا کہ افغانی امرار کے اختلاف اور غداری کی وجہ سے ہیمو بقال سور خاندان کی حکومت پر چھا گیا، وہ افغانی امرار کو اپنے دسترخوان پر بلاتا، ان کو گالیاں دے کر کہتا کہ خوب کھاؤ تاکہ اپنے داماد مغلوں سے لڑ سکو، یہ بے غیرت امرار دم نہ مارتے اور اپنی زبانِ حال سے کہتے۔

ع مرانان وہ کفش بر سر زن

اکبر کو بھی اپنے غدار امرار سے پالا پڑا، وہ اپنی ہوشمندی اور معرکہ آرائی سے ان پر غالب رہا،

لیکن اسلام سے اس نے یہ غداری کی کہ ایک نیا مذہب قائم کرکے اسلام کی تضحیک اور اہانت شروع کردی، بقول کالیکا رنجن قانون گو "اگر وہ واقعی ہندو مسلمان کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہاں تھا تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہیے تھا، لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ نہیں ہوسکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بن جاتا تو مسلمان اسکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، پھر وہ جو کچھ کہتا اس کو ماننے میں ان کو تامل نہ ہوتا، اس نے ہندوؤں کی حمایت میں جو قوانین بنائے اُن میں مسلمانوں کو اس کی نیت میں اخلاص نظر نہیں آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے"

جہانگیر اپنی شہزادگی کے زمانہ میں باپ سے بغاوت کرکے تاج و تخت کا خواہاں ہوا، اس حیثیت سے وہ ایک غدار بیٹا تھا، اس کو خود اپنے شہزادوں میں خسرو اور خرم کی اسی قسم کی غداری کا سامنا کرنا پڑا، شاہ جہان تو اپنے بھائی شہریار اور بھتیجے طہمورث اور ہوشنگ کو قتل کرکے تخت پر بیٹھا، مگر اس کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے شہزادوں کو جانشینی کے لیے خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، اور خود بارہ برس تک نظر بند رہا، اُن اختلافات میں مراد، دارا شکوہ اور شجاع مارے گئے،

تخت و تاج کے لیے بھائیوں کا آپس میں لڑکر ایک دوسرے سے غداری کرنا ایک روایت بن گئی تھی، مغلوں کے آخری دور میں اعظم شاہ، کام بخش، عظیم الشان، جہاں شاہ، کریم، جہاندار شاہ اور فرخ سیر اسی خانہ جنگی ہی میں ہلاک ہوئے، فرمانرواؤں میں بے اعتمادی، بے وفائی، بدعہدی اور عہد شکنی جاری تھی تو انکے امرا اور وزرا میں کیسے اعلیٰ اوصاف پیدا ہوسکتے تھے، وہ اپنی مفاد پرستی میں کبھی نسلی اور قبائلی کبھی ملکی اور غیر ملکی، اور کبھی شیعہ اور سنی کے تعصب کی آگ برابر بھڑکا کر ایک دوسرے سے غداری کرتے رہے، مگر خود اس کے شعلوں میں جلتے بھی رہے، امیر الامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبد اللہ جیسے شاہ گر اسی آویزش میں مارے گئے،

اسلام کے عہد زرین میں اخوت اور وحدت کی اسلامی تعلیم کی وجہ سے عدنانی، قحطانی، مضری، ربیعی، قیسی اور کنانی وغیرہ ایک ہوکر رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ الحق میں سرشار ہوگئے، تو وہ ایران، شام، مصر اور افریقہ پر چھاگئے تھے، اس سے نہ صرف ان کی بلکہ اسلام کی شوکت میں بھی اضافہ ہوگیا تھا، مگر جب یہ تعلیم بھلادی گئی تو خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے بہت سے غدار پیدا ہوتے چلے گئے،

مغلیہ دور کے آخری فرمانرواؤں اور ان کے درباریوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے حکومت تنگ روزگار بن کر رہ گئی تھی، نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا تو اس نے ایک مسلمان سلطنت کے اندر خون کی ندیاں بہاکر اور اسلامی قدروں کی پامالی کرکے اپنی غداری کا ثبوت دیا، المناک منظر یہ بھی تھا کہ کرنال کے میدان میں نادر شاہ اور محمد شاہ سے لڑائی ہوئی تو میدان جنگ میں محمد شاہ کے فوجی امرا میں خان دوران، سعادت خان اور نظام الملک میں حربی تال میل اس لیے نہیں ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ محفوظ رہے، اور دوسرا مارا جائے، تاکہ دربار میں اس کا رسوخ بڑھ جائے، یہ غداری کی کیسی نفرت انگیز صورت تھی، احمد شاہ ابدالی دوسرا غدار تھا، اس نے متواتر حملے اور لوٹ مار کرکے دہلی کی رہی سہی عزت کو خاک میں ملادیا، جس کے بعد انگریزوں کی سامراجیت کیلئے راستہ بالکل ہموار ہوگیا۔

انگریزوں نے اپنی روباہی اور حیلۂ افرنگی سے معلوم نہیں کتنے غدار پیدا کئے، انگریزوں کی حمایت میں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے میر جعفر اور میر صادق نے جو غداری کی، اس کی کسک اور چبھن کو ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں بیان کر دیا ہے،

جعفر از بنگال و صادق از دکن   ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر بھی غداری کے بھینٹ چڑھے، اس پُر آشوب ہنگامہ کے غداروں میں الٰہی بخش، حکیم احسن اللہ خان اور مولوی رجب علی کے نام نمایاں ہیں، الٰہی بخش بہادر شاہ ظفر کے رشتہ دار تھے، حکیم احسن اللہ خان ان کے بڑے معتمد تھے، مولوی رجب علی دونوں کے ہمراز تھے، اول الذکر دونوں

لیکن اسلام سے اس نے یہ غداری کی کہ ایک نیا مذہب قائم کر کے اسلام کی تضحیک اور اہانت شروع کردی بقول کالکارنجن قانون گو" اگر وہ واقعی ہندو مسلمان کے تعلقات کی خوشگواری اور پائداری کا خواہاں تھا تو اسے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا سکھانا چاہیے تھا لیکن اس کی تعمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی، اگر وہ خود اسلام کا سچا پیرو بن جاتا تو مسلمان اسکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے، پھر وہ جو کچھ کہتا اس کو ماننے میں ان کو تامل نہ ہوتا، اس نے ہندوؤں کی حمایت میں جو قوانین بنائے اُن میں مسلمانوں کو اس کی نیت میں اخلاص نظر نہیں آیا، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے،،

جہانگیر اپنی شہزادگی کے زمانہ میں باپ سے بغاوت کر کے تاج و تخت کا خواہاں ہوا، اس حیثیت سے وہ ایک غدار بیٹا تھا، اس کو خود اپنے شہزادوں میں خسرو اور خرم کی اسی قسم کی غداری کا سامنا کرنا پڑا، شاہجہان تو اپنے بھائی شہریار اور بھتیجے طہمورث اور ہوشنگ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا، مگر اس کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کے شہزادوں کو جانشینی کے لیے خونریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، اور خود بارہ برس تک نظربند رہا، اُن اختلافات میں مراد، دارا شکوہ اور شجاع مارے گئے،

تخت و تاج کے لیے بھائیوں کا آپس میں لڑ کر ایک دوسرے سے غداری کرنا ایک روایت بن گئی تھی مغلوں کے آخری دور میں اعظم شاہ کام بخش، عظیم الشان جہاں شاہ، کریم، جہاندار شاہ اور فرخ سیر اسی خانہ جنگی ہی میں ہلاک ہوئے، فرمانرواؤں میں بے اعتمادی، بے وفائی، بدعہدی اور عہد شکنی جاری تھی تو انکے امرا اور وزرا میں کیسے اعلیٰ اوصاف پیدا ہو سکتے تھے، وہ اپنی مفاد پرستی میں کبھی نسلی اور قبائلی کبھی ملکی اور غیر ملکی، اور کبھی شیعہ اور سنی کے تعصب کی آگ برابر بھڑکا کر ایک دوسرے سے غداری کرتے رہے، مگر خود اس کے شعلوں میں جلتے بھی رہے، امیر الامرا سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ جیسے شاہ گر اسی آویزش میں مارے گئے،

اسلام کے عہد زرین میں اخوت اور وحدت کی اسلامی تعلیم کی وجہ سے عدنانی، قحطانی، حضرمی، ربیعی، قیسی اور کنانی وغیرہ ایک ہو کر رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ الحق میں سرشار ہو گئے، تو وہ ایران، شام، مصر اور افریقہ پر چھا گئے تھے، اس سے نہ صرف ان کی بلکہ اسلام کی شوکت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا، مگر جب یہ تعلیم بھلا دی گئی تو خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے بہت سے غدار پیدا ہوتے چلے گئے،

مغلیہ دور کے آخری فرمانرواؤں اور ان کے درباریوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے حکومت تنگ روزگار بن کر رہ گئی تھی، نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا تو اس نے ایک مسلمان سلطنت کے اندر خون کی ندیاں بہا کر اور اسلامی قدروں کی پامالی کر کے اپنی غداری کا ثبوت دیا، المناک منظر یہ بھی تھا کہ کرنال کے میدان میں نادر شاہ اور محمد شاہ سے لڑائی ہوئی تو میدان جنگ میں محمد شاہ کے فوجی امرا میں خان دوران، سعادت خان اور نظام الملک میں حربی تال میل اس لیے نہیں ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ وہ محفوظ رہے، اور دوسرا مارا جائے، تاکہ دربار میں اس کا رسوخ بڑھ جائے، یہ غداری کی کیسی نفرت انگیز صورت تھی، احمد شاہ ابدالی دوسرا غدار تھا، اس نے متواتر حملے اور لوٹ مار کر کے دہلی کی رہی سہی عزت کو خاک میں ملا دیا، جس کے بعد انگریزوں کی سامراجیت کیلئے راستہ بالکل ہموار ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنی روباہی اور حیلۂ افرنگی سے معلوم نہیں کتنے غدار پیدا کیے، انگریزوں کی حمایت میں سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سے میر جعفر اور میر صادق نے جو غداری کی، اس کی کسک اور چبھن کو ڈاکٹر اقبال نے صرف ایک شعر میں بیان کر دیا ہے،

جعفر از بنگال و صادق از دکن   ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر بھی غداری کے بھینٹ چڑھے، اس پُر آشوب ہنگامہ کے غداروں میں الٰہی بخش، حکیم احسن اللہ خان اور مولوی رجب علی کے نام نمایاں ہیں، الٰہی بخش بہادر شاہ ظفر کے رشتہ دار تھے، حکیم احسن اللہ خان ان کے بڑے معتمد تھے، مولوی رجب علی دونوں کے ہمراز تھے، اول الذکر دونوں

انگریزوں کے جاسوس بن کر بہادر شاہ ظفر کو غلط مشورے دیتے اور وہ جو کچھ مجاہدین آزادی کے ساتھ مل کر کرنا چاہتے، اس کی خبریں رجب علی کے ذریعہ سے انگریزوں تک پہونچاتے، ان ہی کی غداری سے بہادر شاہ ظفر گرفتار ہوئے، ظالم ہڈسن نے ان کے شہزادوں میں سے مرزا مغل، خضر سلطان اور ابوبکر کے سر کاٹ کر ان کے پاس بھیجے، پھر قتل عام شروع ہوا تو چاندنی چوک میں ستائیس ہزار مسلمان مارے گئے، اکبر آبادی مسجد شہید اور زینت المساجد کی دیواریں مسمار کر دی گئیں، جامع مسجد کو فوجی بارک بنا دیا گیا، اور وہاں سور ذبح ہونے لگے،

انگریزوں کی سامراجی حکومت کے زمانہ میں بہت سے موقع شناس مسلمانوں کو بڑے بڑے خطابات اس لئے دیے جاتے کہ وہ مسلمانوں سے غداری کر کے مصلحت اندیشی کے نام پر ان کی مذہبی حمیت اور ملی غیرت پر ضرب کاری لگاتے رہیں، اور جب یہ انگریز یہاں سے اپنی دکان بڑھانے لگے تو اس ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر گئے، یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان بننے کے حق میں ووٹ اس لیے دیے کہ ان کو خیال ہوا کہ ایک اسلامی مملکت بن گئی تو مسلمانوں کا مذہب، کلچر، زبان، ملی وجود اور سب کچھ وہاں محفوظ ہو جائیں گے، اس تحریک میں خدا جانے کتنے مسلمانوں کا خون بہا، ان کے گھر لٹے، ان کی عورتوں کی آبرو ریزی ہوئی، اس کی تفصیل مسلمانوں کی تاریخ کی ایک المناک داستان ہے،

پاکستان بنا تو اسلام کو فروغ دینے کے بجائے تھوڑے ہی عرصہ میں بنگالی قومیت کا نعرہ بلند ہوا، اس کے حدی خوان اور رجز خوان شیخ مجیب الرحمن بنے، پھر تو وہاں خون کی ایسی ہولی کھیلی گئی کہ اسلام کی تاریخ کی ساری خونریزیاں بھلا دی گئیں، شیخ مجیب الرحمن نے اسلامی اخوت اور وحدت سے گریزاں ہو کر اس کی قدروں کو جس طرح پامال کیا، اس لحاظ سے وہ ضرور غدار رہیں، وہ مغربی پاکستان سے کٹ کر بنگالی قومیت کے ابوالآبا اور بنگلہ دیش کے صدر یا وزیر اعظم بننا چاہتے تھے، تو غیر بنگالیوں سے نفرت

پیدا کر کے خون بہانے کے بجائے ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لیے اور بھی پُرامن ذرائع تھے، انکی خون آشامیوں کی چاہے جتنی تاویل کی جائے مگر ایک غیر جانب دار مورخ کے قلم اور تحریر پر قدغن لگانا مشکل ہے، پھر خود بنگالیوں نے جس سفاکی اور بے دردی سے ان کو ان کے خاندان کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا اس سے ان کا سیاہ اعمال نامہ ظاہر ہے ع - الامان از جعفران این زمان!

اب مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے نعرے بلند کئے جا رہے ہیں، پاکستان کی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی تھی،

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

اگر یہ صحیح تعلیم تھی تو کیا چار قومیتوں کے نعرے اس سے غداری نہیں۔

ان سطروں میں مسلمان غداروں کی جو لمبی فہرست پیش کی گئی ہے، اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں صرف غدار ہی پیدا ہوتے رہے، ان کے نالۂ نیم شبی، آہ سحرگاہی، اور ایمان پروری سے ان کی ملی سرشت میں جو کبھی ، ہتابی، بلکہ براہیمی اور کلیمی رنگ پیدا ہوتا رہا، اسکی علٰحدہ تاریخ ہے، شب و روز کی بے تابی میں انسان کی سیمابی کیفیت اور اس کی عقل کی روباہی سے اس میں خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی اور بالآخر غداری جیسی مذموم صفات پیدا ہوتی رہتی ہیں، اس کا ذکر فکر فردا کے لیے ضروری ہے، اپنی تاریخ کے محاسن کے ساتھ ہم کو اس کے معائب پر نظر رکھ کر بصیرت حاصل کرتے رہنا چاہئے، اسی بصیرت سے ہمارے نخل کہن میں شادابی، حال میں تابناکی اور مستقبل میں درخشانی پیدا ہوگی،

غداروں اور منافقوں میں زیادہ فرق نہیں، کلام پاک میں منافقوں کی بڑی مذمت کی گئی ہے، ان منافقوں سے ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح پیش آئے، اس کا اسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہے، عبد اللہ بن ابی اسلام کی تاریخ میں منافقوں کا سردار سمجھا جاتا ہے،

اس کی مفسدانہ کاروائیاں اسلام کے بدترین دشمنوں سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں، وہ مسلمانوں
کے مخفی رازدن کو ان کے دشمنوں تک پہونچایا کرتا تھا، وہ اپنے کو مسلمان کہتا، مگر غزوۂ احد میں
شرکت کر کے علٰحدہ ہوگیا، جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہونچا اس نے واقعۂ افک میں
حضرت عائشہؓ پر الزام بھی لگایا، لیکن جب وہ مرا تو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مغفرت کے لیے
نماز پڑھنے کے لیے آگے بڑھے، حضرت عمرؓ نے اس کی ساری باتیں یاد دلائیں تو آپ نے فرمایا،
کہ اگر میری نماز سے اس کی بخشش ہوجائے تو میں اس کے لیے ستر دفعہ نماز پڑھوں،

مسلمان اپنے دشمنوں، بدخواہوں اور نقصان پہونچانے والوں کے ساتھ اسی اسوہ پر
عمل کرتے رہتے تو وہ رحمۃ للعالمینؐ کے صحیح پیرو ہوتے، مگر وہ تو آپ کے پیامِ رحمت کو بھول
گئے، اور بھولتے جارہے ہیں، اسی لئے ع

امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں

مگر ان کے لیے یہ بھی بشارت ہے،

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا ۔۔۔ آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

دار المصنفین سے ابھی ایک نئی کتاب صوفی امیر خسرو شائع ہوئی ہے جس کے مطالعہ سے
یہ ظاہر ہوگا کہ حضرت امیر خسرو نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے ایک جانثار مرید ہونے کی حیثیت سے
راہ سلوک پر گامزن ہونے کے بعد کیا درجہ حاصل کیا، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف
میں عرب و ہند کے تعلقات، خیام، نقوش سلیمانی، خطبات مدراس اور رحمت عالم ان کی ذاتی
ملکیت تھیں، لیکن دارالمصنفین نے ان کا حق طباعت باضابطہ طور پر خرید لیا ہے، ان میں سے کوئی تاجر
ایک کتاب بھی اپنے ذاتی مفاد کے لئے شائع نہ کرے، اگر اس نے شائع کیا تو اس کے خلاف
قانونی کاروائی کی جائے گی۔

مقالات

شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید مسعود گنج شکرؒ کے

مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء کا مطالعہ

از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی

(۳)

روایت [۱] حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ جب تلاوتِ
قرآن پاک فرماتے اور کسی آیت وعید (عذاب کی آیت) پر پہنچتے تو سینے پر ہاتھ مارتے اور بیہوش ہوکر
گرجاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہوجاتے اور اس طرح
دن میں ہزار بار بیہوش ہوتے اور ہوش میں آتے تھے، (روزے ہزار بار بیہوش آمدے) اسی طرح
جب آپ آیت مشاہدہ (دیدار الٰہی کی آیت) پر پہنچتے تو مسکراتے اور اٹھ کھڑے ہوتے، اور
عالم مشاہدہ میں متحیر رہتے ایک رات دن عالم مشاہدہ میں ایسے متحیر رہتے کہ اپنی بھی خبر نہ رہتی، [۱]
یہ مخصوص ترین کیفیت ہے، جو عام حالات سے ممیز ہے۔ اس کا تعلق
مراتب سلوک سے ہے،

تو نظر باز نہٗ ورنہ تغافل نگہ ست ۔۔۔ تو زبان فہم نہٗ ورنہ خموشی سخن ست

---

[۱] اسرار الاولیاء ص ۳۱۔

اس کا احساس تو کیا جا سکتا ہے، مگر اصل کیفیت کو نہ گرفت میں لایا جا سکتا ہے، اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے. کیفیات کی ترجمانی قوت بشری سے باہر ہے، اس میں یہی راز سربستہ ہے، اہل زبان کی روش سے کم آگاہی ہزار بار پر بھی انگلی دھرے گی، مگر سمجھ لینا چاہیے کہ عرف عام میں ہزار سے مراد گنتی نہیں کثرت ہے، مرزا غالبؔ کہہ گئے ہیں، ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

محاورے میں کہتے ہیں ہزار بار سمجھایا باز نہ آئے، اب بھگتو خمیازہ اس کا، یہ بھی ہے کہ ایسی حالت میں گنتی گنی ہی نہیں جاتی. قرینے ہی سے کہہ دیا جاتا ہے، مراد ہوتی ہے کثرت، اس روایت میں یہی دو نکتے تھے، جو حل ہو گئے، ورنہ ہر دانش ور ہر اعتبار سے روایت کی معنویت اور اسلوب کی لطافت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا.

روایت ۸ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ کل قیامت کے دن جب عاشقوں کو مقام تجلی میں لایا جائے گا تو حکم ہوگا کہ آنکھیں کھولو، پھر عاشقوں میں سے ہر ایک کو آگے لایا جائے گا، اور ہر ایک پر ہر بار تجلی ہوگی، وہ سات ہزار برس تک بیہوش رہیں گے، جب ہوش میں آئیں گے، تو فریاد کریں گے هَلْ مِنْ مَزِيد، ان پر پھر تجلی ہوگی، ستر مرتبہ ایسا ہی ہوگا، پھر وہ اپنی جگہ آجائیں گے، حضرت باباصاحبؒ نے یہ بیان فرمانے کے بعد آہ کی اور بیہوش ہو گئے اور بیہوشی ہی کے عالم میں یہ رباعی پڑھی

از مہر رخِ تو مبتلا می باشم — اندر غمِ عشق در بلا می باشم
دنیاد جمال تو چنان مدہوشم — کز خود خبرے نیست کجا می باشم ؎۱

اس بیان کا اور اس روایت کا تعلق عالم بقا سے ہے، جو اس عالم فنا سے مختلف ہے، یہ مادی ہے اور وہ غیر مادی، وہاں کی کیفیات کو اس عالم کی مشابہت سے بیان کرنا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بیان کیا جاتا ہے، وہ تشبیہ و تمثیل سے منزہ ہوتا ہے، بیہوشی سلوک کی اصطلاح ہے،

۱؎ اسرار الاولیاء ص ۳۴

اس حالت میں سالک صفات ذات میں محو ہوتا ہے، اسی سے عالم باقی کی اس کیفیت کا احساس کیا جا سکتا ہے جسے بیہوشی سے تعبیر کیا ہے، اس کی فہمید کا تعلق عرفا سے ہے، ہر کس و ناکس سے نہیں ہے، یہ ایسی ہی بات ہے کہ منطق و فلسفہ کی اصطلاحات کو علمائے منطق و فلسفہ ہی جانتے ہیں، جو ان علوم سے آگاہ نہیں، وہ نہیں جانتے.

دوسری چیز ہے طول مدت، اس کا تصور واقعۂ معراج سے کیا جا سکتا ہے کہ یہاں بستر بھی گرم رہا، کنڈی بھی ہلتی رہی، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی کی سیر بھی فرمالی، ان نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس روایت کو سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ نا آشنائے تصوف اس کی فہمید سے قاصر رہتے ہیں، وہ کچھ بھی کہیں ان کا کہنا معتبر نہیں، ؎

تلقین درس اہل نظر یک اشارت است — کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

روایت ۹ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعا گو اور خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ بالا ملک کی طرف سفر میں تھے، سوتہ نامی دریا کا کنارہ تھا، ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو وہاں کوئی کشتی نہ تھی، جو ہم پار جاتے، مقام بھی خوف کا تھا، حضرت خواجہؒ نے فرمایا، فرید آؤ پار چلیں، میں نے عرض کیا زہے سعادت، مگر دل میں یہ بات آئی کہ کشتی تو ہے نہیں، پار کیسے ہوں گے، دل میں یہ خطرہ گزرا ہی تھا، کہ اپنے کو اور حضرت خواجہ صاحبؒ کو دریا پار کھڑے دیکھا، موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ ہم کیسے پار ہو گئے تھے، آپ نے فرمایا کہ جب دیکھا کہ دریا کے کنارے کشتی نہیں ہے تو میں نے سورۂ اخلاص قل ھو اللہ احد پڑھ کر دریا پر دم کیا، دریا شق ہو گیا، اور ہم پار چلے آئے. (اسرار الاولیاء ص ۳)

پوری حکایت سادہ اور عام فہم ہے، البتہ دریا کا راستہ دینا خوارق عادت میں سے ہے لیکن صوفیۂ کرام کے حالات میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں، اور ان کتابوں میں ملتے ہیں، جنھیں اولیا دشمن نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں، گویا کہ ایسے واقعات صوفیہ کے معمولات

میں سے ہیں عجائبات میں سے نہیں ہیں،

امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دریا کی طرف سفر میں تھے، . . . . ہم نے دریا پار جانا چاہا، کشتی تھی نہیں، ہم نے دعا کی تو بحکم خدا دریا نے ہمیں راستہ دیدیا، آپ کا مبارک بیان یہ ہے:۔

دست بدعا بردیم بفرمانِ خدائے تعالےٰ	ہم نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے خدا کے
دریا دوشق شد زمیں خشک پیدا شد،	حکم سے دریا شق ہو گیا، خشک زمین نکل
ما گزشتیم [1]	آئی اور ہم دریا پار چلے گئے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ کی زبانی نقل کیا ہے:۔

خواجہ معین الدین حسن سنجری طیب اللہ	خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ
مضجعہ می فرمود کہ وقتے من برابر خواجہ	فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ عثمان
عثمان ہرونی در سفر بودم در کنارۂ دجلہ	ہرونیؒ کے ہمراہ سفر میں تھا، جب ہم دریائے
رسیدیم کشتی نبود خواجہ عثمان قدس اللہ	دجلہ کے کنارے پہنچے تو وہاں کشتی نہ تھی،
سرہٗ العزیز فرمود کہ چشم پیش کن چشم پیش	خواجہ عثمان ہرونیؒ نے فرمایا، آنکھیں بند
کردم خواجہ را خود را در گزرے دجلہ	کر لو، میں نے آنکھیں بند کر لیں، آنکھیں کھولیں
دیدم، از خواجہ عثمان قدس اللہ سرہٗ	تو دیکھا کہ ہم دونوں دریا کے پار ہیں،
العزیز پرسیدم کہ شما ایں چہ کردید،	میں نے خواجہ عثمان ہرونیؒ سے دریافت
فرمود چند بار سورۂ فاتحہ خواندم۔	کیا تو فرمایا میں نے چند بار سورۃ الحمد شریف
(سیر الاولیا ص ۴۴ پ)	پڑھی تھی،

[1] سیر الاولیا ص ۵۲ پ

مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ذکر میں فرمایا۔

از وے روایت کردہ اند، پیر من ہفتاد	وہ یہ بیان کرتے تھے کہ میرے پیر کے
مرید تارک داشت، پوشش ایشاں میزری	ستر مرید تارکِ دنیا تھے، ان کا لباس
دو عرق چیں در بر کلاہ بر سر او اگر ایں پیش	تہمد تھا، اور بدن میں عرق چین یعنی پسینہ
آمدے و کشتی نہ بودے پائے می نہادند	کو جذب کرنے والا لباس اور سر پہ ٹوپی
و می گزشتند (خیر المجالس ص ۱۵۱)	(سارا ہی لباس سادہ تھا مگر ایسے
	باکمال تھے) کہ دریا آجاتا اور کشتی نہ ہوتی
	تو (پانی ہی پر) پیر رکھتے اور چلے جاتے تھے

گویا کہ اسرار الاولیار کا مذکورہ واقعہ بھی کچھ ایسا واقعہ نہیں ہے، جو دیگر کتبِ ملفوظات میں مندرجہ واقعات کے لگ بھگ نہ ہو،

روایت ۲ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا، دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ ایک بزرگ پانی پر مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں، جب نماز پڑھ چکے تو سجدہ میں سر رکھا اور سجدے ہی میں جناب باری میں التجا کرتے رہے کہ خداوندا! حضرت خضرؑ سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہو رہا ہے، آپ انھیں توبہ کی توفیق عنایت فرمائیے، اتنے میں حضرت خضرؑ بھی آ گئے، اور دریافت کیا کہ اے بزرگوار! میں کون سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں، انھوں نے کہا کہ تم نے جنگل میں (فی سبیل اللہ) درخت بویا جب وہ بار آور ہو گیا تو تم اس کے سایے میں بیٹھتے اور آرام کرتے ہو، اور کہتے ہو کہ یہ درخت میں نے خدا کے لیے بویا ہے، حضرت خضرؑ نے توبہ کی،

پھر ان درویش نے ترک دنیا اور حق درویشی سے متعلق حکایت بیان کر کے فرمایا کہ اس طرح رہو، جس طرح میں رہتا ہوں، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ آپ کس طرح رہتے ہیں، اور کیا کرتے ہیں

ان بزرگ نے کہا کہ میں اس طرح رہتا ہوں کہ اگر مجھے ساری دنیا عنایت فرمائیں اور کہیں کہ تم سے اس کا حساب بھی نہ لیا جائے گا، اور یہ بھی کہیں اگر قبول نہ کروگے تو دوزخ میں ڈال دیئے جاؤگے تو میں دوزخ میں پڑنا قبول کرلوں گا، مگر دنیا کو لینا گوارا نہ کرونگا، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ کیوں، انھوں نے فرمایا اس لیے کہ وہ (دنیا) خدائے عزوجل کی مبغوضہ ہے، جس چیز کو اللہ پاک دشمن قرار دیں میں اسے قبول نہ کرونگا، اس کی بجائے دوزخ کو قبول کرلوں گا،

حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ میں ان کے نزدیک ہوا، اور سلام کیا، نہر حائل رہی، انھوں نے کہا آجاؤ، میں سوچنے لگا کہ پانی کو عبور کیسے کروں، میں اسی فکر میں تھا کہ خشکی نمودار ہوئی، میں چلا اور ان کے پاس پہنچ گیا، تھوڑی دیر بعد انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا اے فرید! چالیس برس ہوئے کہ میں سونے کے لئے لیٹا تک نہیں، لیکن اے درویش میرے مقام میں مجھے کھانے کو ملتا ہے، تو جب تک کوئی آنے والا آ نہیں جاتا اور میں اپنے ساتھ اسے کھلا نہیں لیتا مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوتا، اتنے میں دو پیالے سالن کے اور چار روٹیاں ہلکی ہلکی سی عالم غیب سے آئیں، ایک پیالہ میرے آگے رکھا اور دوسرا اپنے آگے، دونوں نے کھانا کھایا، جب رات ہوگئی تو عشا کی نماز پڑھی، پھر وہ بزرگ نماز نفل پڑھنے لگے، میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگا، انھوں نے دو رکعات نماز میں چار بار قرآن پاک ختم کیا، ہر رکعت میں دو قرآن پاک ختم کرتے تھے، اس کے بعد سلام پھیرا اور سر سجدے میں رکھا، اور زار وقطار رونے لگے، اور عرض کیا کہ خداوندا میں نے آپ کے شایانِ شان عبادت نہیں کی جو میں یہ سمجھوں کہ میں نے کچھ کیا ہے، اس کے بعد صبح کی نماز پڑھی، اور مجھے رخصت کیا، میں نے اپنے کو دریا کے کنارے کھڑا پایا، اور وہ بزرگ نظروں سے غائب ہوگئے، نہیں معلوم کہاں گئے،

اس کے بعد حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ اے درویش درویشی یہ تھی جو وہ رکھتے تھے کہ

دنیا کی چیزوں میں سے ان کے پاس ٹوٹی ہوئی پانی کی ٹھلیا کے سوا اور کچھ نہ تھا، رات ہوتی تو اس کا پانی بھی پھینک دیتے تھے، اور رات دن تجرید ومحاسبہ میں مشغول رہتے تھے، (اسرار الاولیار ص ۴۴-۴۵)

یہ حکایت بہت دلچسپ اور نہایت سبق آموز ہے، اس میں مافوق العادۃ عنصر بھی ہے، اس روایت کو خواجہ حسن علائے سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے، بیان میں وہی فرق ہے جو فطرتاً دو صاحبوں کے بیان میں ہوا کرتا ہے،[1] لیکن موازنہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا ضبط الفاظ خواجہ حسن علائے سجزیؒ کے ضبط الفاظ سے افضل واعلیٰ ہے، محل غور ہے کہ ایک ہی خیال کو دونوں صاحبوں نے کس کس طرح بیان فرمایا ہے، مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے لکھا ہے،

مصلی برآب انداختہ نماز می گزارد چوں	پانی پر مصلی ڈالے نماز پڑھ رہے ہیں،
از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و مناجات	جب نماز سے فارغ ہوے، سر سجدے میں
می گفت،	رکھا اور التجا کرتے رہے،

خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ نے لکھا ہے،

مصلی بر روئے آب انداختہ بود و نماز	پانی پر مصلی ڈال رکھا تھا، اور نماز
می کرد و می گفت خداوندا! الخ	پڑھتے رہے اور کہتے رہے کہ خداوندا

(فوائد الفواد ص ۸۲)

جسے علم وفن سے ذرا بھی آگاہی ہے وہ ان جملوں کے اوصاف سے واقف ہے کہ چوں از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و مناجات می گفت اقتضائے حال کے مطابق ہے، یا یہ کہ نماز می کرد و می گفت، (نماز پڑھتے رہے اور کہتے رہے) نماز میں کچھ کہتے رہنا کہاں تک مناسب ہے اولیاء اللہ تو ہمہ تن ذات الٰہی میں محو ہوجاتے ہیں، اور اگرچہ مدعا یہی ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد

---

[1] تفصیل کے لیے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۷۹ء ص ۱۰۵، تا ۱۰۲ ملاحظہ فرمایئے،

دعا کی مگر ظاہر ہے، اسرار الاولیاء کا اسلوب زیادہ اقتضائے حال کے مطابق ہے بہر نوع اسرار الاولیاء کو اسلوب بیان اور ماخذ کے اعتبار سے ترجیح حاصل ہے،

روایت ۳ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ زمانۂ ماضی میں ایک بزرگ تھے جو بیس[۲۰] سال عالم تحیر[۱] میں رہے، ایک سال گزرتا تو وہ عالم صحو[۲] میں آتے، ان کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا، البتہ ایک چھوارا تھا، جو ان کی خانقاہ کے طاق میں رکھا رہتا تھا، جب بھوک کا غلبہ ہوتا تو وہ اس چھوارے کو طاق میں سے اٹھاتے اور چوس لیتے پھر وہیں رکھ دیتے کہتے ہیں کہ پچاس[۵۰] برس تک یہی کرتے رہے، ابھی وہ کچھ باقی ہی تھا کہ ان بزرگ کا انتقال ہوگیا، اور وہ رحمت حق سے جا ملے (اسرار الاولیاء صہ۵)

اس حکایت میں سلوک کی دو اصطلاحیں آگئی ہیں، (۱) تحیر (۲) صحو، سالک کے مرتبۂ احدیت میں محو ہونے اور مشاہدۂ حق میں مستغرق رہنے کو حیرت و تحیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور صحو کہتے ہیں ہوش میں آنے یا رہنے کو مراد اس سے یہ ہے کہ انہماک و توحید حقیقی تک رسائی حاصل ہونے کے باوجود سالک حفظ مراتب سے غافل نہ ہو،

یہ حکایت بلاشبہ عجائبات روزگار سے ہے، تاہم ہر عہد میں عجوبۂ روزگار شخصیتیں عالم وجود میں آتی رہی ہیں، اور کتب ملفوظات میں ایسے بزرگوں کا ذکر خوب ملتا ہے، خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل فرماتے ہیں:۔

بقالے بود علیہ الرحمۃ در مدت بست و پنج	ایک بقال تھا اس پر خدا کی رحمت ہو،
سال صائم بود، ہیچ کس را بر حال او	پچیس[۲۵] برس روزہ دار رہا، کسی کو خبر نہ
اطلاع نہ بود کہ او صائم می باشد اگر در	ہوئی کہ وہ روزے سے ہے، حتیٰ کہ

---

۱ عالم تحیر: عالم، سالک کا مرتبہ احدیت میں محو ہونا، اس مقام کی کیفیات احاطۂ تحریر و تقریر میں نہیں سما سکتیں، اسی کو عالم سکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۲ صحو: بیہوشی سے ہوش میں آنا، یا سالک کا انتہائے توحید حقیقی میں پہنچ کر فرق مراتب سے غافل نہ ہونا، مگر یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں۔

خانہ بودے چناں نمودے کہ در دکان چیزے	اس کے گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوئی، اگر وہ
خوردہ است و اگر در دکان بودے	گھر میں ہوتا تو یہ ظاہر کرتا کہ اس نے دکان پر
چناں نمودے کہ در خانہ چیزے خوردہ است	کھانا کھا لیا ہے، اور دکان پر ہوتا تو یہ
(فوائد الفواد، ص ۲۴)	ظاہر کرتا کہ گویا اس نے گھر پر کھا لیا ہے،

اسرار الاولیاء میں شیخ بزرگ کی حکایت ہے، اور یہ ایک بقال کی کیفیت ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے رشید پنڈت کا ذکر فرمایا ہے کہ اسے کاروباری مشغولیت میں کھانا یاد ہی نہ آتا تھا، اور یہ کلیہ بھی بیان فرمایا ہے،

در عالم عشق ہم چنین است چوں دل	عشق کے عالم میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ
عاشق بہ معشوق متعلق می شود، او را	جب محب کا دل محبوب سے متعلق
طعام و خواب یاد نمی آید، جائے کہ در	ہو جاتا ہے تو اسے کھانا اور سونا یاد نہیں
عالم ظاہر این معاملہ است در عالم	آتا جب عالم ظاہر میں یہ کچھ ہے، تو عالم
باطن ہر طریق اولیٰ، آں کہ مشغول	باطن میں بطریق اولیٰ ہے، جو بھی عالم
مشاہدات عالم غیبی باشد طعام کہ؟	غیب کے مشاہدے میں محو و مستغرق
آب کہ؟ خواب کہ؟ (خیر المجالس صہ۹۳)	ہوتا ہے، اس کے لیے کھانا پینا اور سونا کیسا،

حضرت مخدومؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

عبادت ظاہری سبب می شود برائے	عبادت ظاہری غذا کا سبب ہوتی ہے
غذا و ہمیں عبادت ظاہری جائے غذا می	(عبادت ظاہری سے بھوک لگتی ہے)
شود برائے اشتہا	اور یہی ظاہری عبادت غذا بن جاتی ہے،
.... بعد ازاں فرمودند ذکر ہم سبب	اور اگر کسی کو ذوق و شوق نہیں ہے تو وہی

اشتہا است دہم بجاے غذا اما مراقبہ در ہمہ حال بجاے غذا است زیرا کہ در مراقبہ حضور و مشاہدہ است، و جوارح در حرکت نمی آید۔ ملائم ایں فرمودند کہ خواجہ عقال مغربی چہار سال در کعبہ مراقب بود دریں چہار سال طعام و آب نخورد (خیر المجالس ص ۱۵۳ - ۱۵۴)

.... پھر فرمایا کہ ذکر بھوک بھی لگاتا ہے اور غذا بھی بن جاتا ہے، مگر مراقبہ ہر حال میں غذا کا قائم مقام ہے، کیونکہ مراقبے میں حضور و مشاہدہ ہے اور اعضا حرکت میں نہیں آتے، اسی سے متعلق یہ فرمایا کہ خواجہ عقال مغربیؒ چار سال کعبۃ اللہ میں مراقب رہے، اس چہار سالہ مدت میں انھوں نے نہ کھایا

خواجہ عقال مغربیؒ کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہفت سال طعام نہ خورد، چوں وقت نماز شدے، بہ خود آمدے، برخاستے نماز گزاردے، باز در مراقبہ شدے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے سات برس کھانا نہیں کھایا جب نماز کا وقت ہوتا، ہوشیار ہو جاتے، اٹھتے نماز پڑھتے، پھر مراقبے میں مشغول ہو جاتے،

(خیر المجالس ص ۹۲)

کتب ملفوظاتِ مشائخِ چشت رحمہم اللہ میں ایسے واقعات اور بھی ملتے ہیں، حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے فرمایا:-

شیخ شرف الدین (بو علی قلندر) پانی پتی نے تیس سال تک کھانا نہیں کھایا
(جوامع الکلم ملفوظ ۱۰- رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

یہ بھی فرمایا ہے:-

سید مصریؒ ایک خطاط تھے، انھوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے اٹھائیس برس سے پانی نہیں پیا ہے، (جوامع الکلم ملفوظ ۱۰ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے اشتہا پیدا نہ ہونے اور مدتوں تک کچھ نہ کھانے پینے کی حکمت بھی بیان فرمادی ہے، جنھیں علم تصوف سے ذرا بھی آگاہی ہے، وہ جانتے ہیں کہ راہِ سلوک میں ایسے مقام بھی آتے ہیں، جن کی فہم سے سطحی اذہان معذور رہتے ہیں، اسرار الاولیاء کی مذکورہ حکایت آئین تصوف کے مطابق اور نہایت درجہ موقر ہے،

روایت ۹ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ بزرگان دین میں سے ایک بزرگ تھے، انھیں عبد اللہ خفیفؒ کہتے تھے، چالیس سال تک وہ رات کو نہیں سوئے بلکہ لیٹے تک نہیں، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روئے کہ ان کے مبارک رخساروں پر گوشت نام کو بھی نہ رہا تھا، یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنالیے تھے، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے ایسے حیران و سراسیمہ تھے کہ انھیں چڑیوں کی آمد و رفت کی خبر تک نہ ہوتی تھی، جب وہ بزرگ قیامت کی باتیں اور قبر کی کیفیت سنتے تو مثل بید کانپنے لگتے، زمین پر گر پڑتے اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے، جب ہوش میں آتے تو اٹھتے اور یہ آیت پڑھتے۔ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ ؕ زار و قطار روتے اور فرماتے میں کچھ نہیں جانتا کہ کس فریق میں ہوں گا۔ ساری عمر انھوں نے اسی طرح گزاری اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ (اسرار الاولیا ص ۵۸)

یہ روایت بھی محیر العقول اور عجائباتِ روزگار میں سے ہے، لیکن ایسی روایتیں دیگر کتبِ ملفوظات میں بھی ہیں، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ صوفیۂ کرام کے احوال سے ایسی روایات کو خصوصی علاقہ ہے، یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ یہ جملہ کہ یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنالیے تھے، الخ بعض نسخوں میں نہیں ہے، اس کے ماسوا "چنانچہ می گویند"

اشتہا است و ہم بجائے غذا ہا مراقبہ در ہمہ حال بجائے غذا است زیرا کہ در مراقبہ حضور و مشاہدہ است، و جوارح در حرکت نمی آید۔ ملائم ایں فرمودند کہ خواجہ عقال مغربی چہار سال در کعبہ مراقب بود دریں چہار سال طعام و آب نخورد

(خیر المجالس ص ۱۵۳ - ۱۵۴)

...... پھر فرمایا کہ ذکر بھوک بھی لگاتا ہے اور غذا بھی بن جاتا ہے، مگر مراقبہ ہر حال میں غذا کا قائم مقام ہے، کیونکہ مراقبے میں حضور و مشاہدہ ہے اور اعضا حرکت میں نہیں آتے، اسی سے متعلق یہ فرمایا کہ خواجہ عقال مغربیؒ چار سال کعبۃ اللہ میں مراقب رہے، اس چہار سالہ مدت میں انھوں نے نہ کھایا نہ پیا

خواجہ عقال مغربیؒ کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہٗ العزیز ہفت سال طعام نہ خورد، چوں وقت نماز شدے، بہ خود آمدے، برخاستے نماز گزاردے، باز در مراقبہ شدے،

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے سات برس کھانا نہیں کھایا جب نماز کا وقت ہوتا، ہوشیار ہو جاتے، اٹھتے، نماز پڑھتے، پھر مراقبے میں مشغول ہو جاتے،

(خیر المجالس ص ۹۲)

کتب ملفوظاتِ مشائخِ چشت رحمہم اللہ میں ایسے واقعات اور بھی ملتے ہیں، حضرت خواجہ گیسو درازؒ نے فرمایا:-

شیخ شرف الدین (بو علی قلندر) پانی پتی نے تیس سال تک کھانا نہیں کھایا

(جوامع الکلم ملفوظ ۱۰- رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

یہ بھی فرمایا ہے:-

سید مصریؒ ایک خطاط تھے، انھوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے اٹھائیس برس سے پانی نہیں پیا ہے، (جوامع الکلم ملفوظ ۱۰ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے اشتہا پیدا نہ ہونے اور مدتوں تک کچھ نہ کھانے پینے کی حکمت بھی بیان فرما دی ہے، جنھیں علم تصوف سے ذرا بھی آگاہی ہے، وہ جانتے ہیں کہ راہ سلوک میں ایسے مقام بھی آتے ہیں، جن کی فہمید سے سطحی اذہان معذور رہتے ہیں، اسرار الاولیاء کی مذکورہ حکایت آئین تصوف کے مطابق اور نہایت درجہ موقر ہے،

روایت ۹ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ بزرگان دین میں سے ایک بزرگ تھے، انھیں عبداللہ خفیفؒ کہتے تھے، چالیس سال تک وہ رات کو نہیں سوئے بلکہ لیٹے تک نہیں، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روئے کہ ان کے مبارک رخساروں پر گوشت نام کو بھی نہ رہا تھا، یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنا لیے تھے، اور وہ خدائے تعالیٰ کے خوف سے ایسے حیران و سراسیمہ تھے کہ انھیں چڑیوں کی آمد و رفت کی خبر تک نہ ہوتی تھی، جب وہ بزرگ قیامت کی باتیں اور قبر کی کیفیت سنتے تو مثل بید کانپنے لگتے، زمین پر گر پڑتے اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے، جب ہوش میں آتے تو اٹھتے اور یہ آیت پڑھتے، فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ زار و قطار روتے اور فرماتے میں کچھ نہیں جانتا کہ کس فریق میں ہوں گا۔ ساری عمر انھوں نے اسی طرح گزاری اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ (اسرار الاولیاء ص ۵۸)

یہ روایت بھی محیر العقول اور عجائباتِ روزگار میں سے ہے، لیکن ایسی روایتیں دیگر کتبِ ملفوظات میں بھی ہیں، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ صوفیۂ کرام کے احوال سے ایسی روایات کو خصوصی علاقہ ہے، یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ یہ جملہ کہ یہ کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنا لیے تھے، الخ بعض نسخوں میں نہیں ہے، اس کے ماسوا "چنانچہ می گویند"

اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وہ روایت ہے، جو بطور افواہ عوام کی زبان پر ہے، اس کا کوئی معتبر راوی نہیں ہے، بات کا بتنگڑ بنا دینا عوام کی عادت ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد روایت میں کوئی خلفشار نہیں رہتا۔

اب رہی یہ بات کہ چالیس سال تک وہ رات کو نہ سوئے، تو کاملین صوفیۂ کرام کے احوال میں ایسے واقعات ملتے ہی ہیں، چنانچہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

شجاع کرمانی چہل سال شب نہ خفت، (فوائد الفواد ص ۴۰)	شجاع کرمانیؒ چالیس سال تک رات کو نہ سوئے،

اسی روایت کو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے دہرایا ہے، فرماتے ہیں:۔

شاہ شجاع کرمانیؒ فرمود چہل سال نخفت، (خیر المجالس ص ۲۳۹)	شاہ شجاع کرمانیؒ نے فرمایا کہ وہ چالیس سال سوئے نہیں،

فوائد الفواد اور خیر المجالس کے بیانات سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ روایت بھی صوفیۂ کرام سے خصوصی رابطہ رکھتی ہے، اور خشیتِ ایزدی کی ترجمان ہے، اور اس کا اسلوبِ بیان یہ بتاتا ہے، کہ اس کا تعلق حضرت باباصاحبؒ ہی سے ہے،

روایت نمبر ۱ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ اے درویش شیر خاں ملتان کا حاکم تھا، وہ دعاگو سے صاف نہیں تھا، خلش رکھتا تھا، میں نے بارہا نہایت نرمی اور ہمدردی سے کہا اور سمجھایا کہ درویشوں سے بغض و کینہ مناسب نہیں ہے، بلکہ ملک کی تباہی و بربادی کا سبب ہے، مگر وہ نہ مانا اور من مانی ہی کرتا رہا، انجام کار تاتاریوں نے اُچ پر یورش کی اور لوٹ مار بھی کی قضاء عنداللہ صرف وہی مارا گیا، پھر آپ نے یہ شعر پڑھا۔ (اسرار الاولیاء ص ۶۹)

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام ——— گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال ؎[1]

یہ واقعہ بروئے تاریخ ۶۶۲ھ کا ہے، اسی واقعہ کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی بیان فرمایا ہے خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ نے لکھا ہے،

شیر خان والیٔ اُچ و ملتان بود، در حق شیخ الاسلام شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز چنداں اعتقادے نداشت تا بارہا شیخ الاسلام در معنیٔ او ایں دو مصرع بگفتے ؎	شیر خان اُچ اور ملتان کا حاکم تھا حضرت باباصاحبؒ کے متعلق کچھ اچھا اعتقاد نہ رکھتا تھا، یہاں تک کہ حضرت باباصاحبؒ نے اس کے متعلق بارہا یہ شعر پڑھا
افسوس کہ از حال منت نیست خبر	افسوس کہ تجھے میرے حال کی کچھ بھی خبر نہیں
آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری	البتہ جب تجھے پتہ چلے گا تو افسوس کرے گا
بعد ازاں فرمود کہ چوں شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز از دنیا بر رفت ہماں سال کافراں دراں دیار رسیدند۔	اس کے بعد فرمایا کہ حضرت باباصاحبؒ کا انتقال ہوگیا، تو اسی سال کافر اس شہر میں آپہنچے۔

(فوائد الفواد ص ۲۲۰-۲۲۱)

مفہوم کے اعتبار سے دونوں بیان یکساں ہیں، الفاظ کا ردوبدل فطری شے ہے، جو دو مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا ہے، البتہ اشعار مختلف ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے، البتہ فوائد الفواد میں بعد از

(حاشیہ ص ۲۰) ؎ اسرار الاولیاء کی اصل فارسی عبارت یہ ہے:۔

اے درویش شیر خان والیٔ ملتان بود، چنداں عقیدہ بر دعاگوئے نداشت، ہر بار بطریق بہتری گفتم، کہ با درویشاں کینہ کردن نیکو نیست کہ خلل ملک تو ست او التفات نہ کردے چنانچہ وقتے در حوالیٔ اُچ مغل رسید ہیچ کشتہ نہ شد مگر ہموں، آں گاہ بر لفظ مبارک ایں دو مصرع راند بیت ؎

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام ——— گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال

(اسرار الاولیاء ص ۶۹)

بعد جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق اس واقعہ سے نہیں ہے، کیونکہ شیر خاں کا واقعہ ۶۶۲ھ کا ہے، اور اس بیان میں حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد کے واقعہ کا ذکر ہے، اس کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے۔

"بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیار اجودھن رسیدند خواجہ نظام الدین از جہت مردی و غایت دلاوری بحرب کفار پیوست بعد اقتال بسیار شہادت یافت (سیر الاولیاء ص ۱۹۰)

یہ خواجہ نظام الدین حضرت باباصاحبؒ کے چوتھے صاحبزادے تھے، غالباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی ذکر فرمایا تھا کہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد یہ حادثہ بھی پیش آیا تھا، جو حضرت باباصاحبؒ کے فرمودہ اس شعر سے بھی متعلق ہے، جو اسرار الاولیاء میں اس ذکر کے بعد ہے، خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ کے اسلوب میں ایجاز ہے، انھوں نے بعد ازاں سے اس واقعہ کو علٰحدہ تو کر دیا ہے لیکن پھر بھی مبہم ہی رہا، اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جس میں شیر خان مارا گیا تھا، مگر ایسا ہی نہیں کیونکہ یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد کا ہے اور شیر خان کے مارے جانے کا واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی حیات سنہ ۶۶۲ کا ہے، یہ واقعہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے راحت القلوب میں بھی قلم بند فرمایا ہے، آپ کا مبارک بیان یہ ہے،

شیر خان والی اچ و ملتان بود، در حق دعا گوے چنداں عقیدہ نہ داشت کہ بر زبان آید بارہا در حق او ایں بیت گفتہ، ؎

افسوس کہ از حال منت نیست خبر — آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

بعد از چند روز ہماں سال کفار در رسیدند۔ تمام نہیب کردند و بردند۔ (راحت القلوب ص ۱۶-۱۷)

تینوں بیان سامنے ہیں، مگر یہ وضاحت صرف اسرار الاولیاء میں ہے کہ مغلوں کی یورش اچ کے گرد و نواح میں تھی، دوسرے یہ وضاحت بھی اسرار الاولیاء ہی میں ہے کہ حملہ آور مغل (تاتاری) تھے، کفار و کافراں میں یہ وضاحت کہاں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء کے بیان کو

ترجیح ہے، خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ کا بیان ایجاز کی بنا پر قدرے گنجلک ہو گیا ہے، اس لیے اس کا مقام تیسرا ہے، اولیت اسرار الاولیاء کے بیان کو حاصل ہے، اور یہ وصف تقابل میں بھی اسرار الاولیاء کے مستند ہونے کی بین دلیل ہے، ع صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کے لیے۔

روایت نمبر ۱۱ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا ایک دفعہ سلطان ناصر الدین (محمود) علیہ الرحمۃ والغفران ملتان جا رہا تھا تو جب اجودھن (پاکپتن) پہنچا تو مجھ سے ملنے آیا، جو آداب ملاقات ہیں اس نے انجام دیئے، اور چلا گیا، (فوجی جو اس کے ساتھ تھے وہ بکثرت آتے رہے) جب میں ہجوم خلق سے عاجز ہو گیا تو میں نے تنہائی اختیار کرنی چاہی، لیکن پھر یہ سوچا کہ ہمارے بزرگوں نے ایسا نہیں کیا ہے، سب ہی سے مصافحہ کیا ہے، میں ایک چھت پر جا کے بیٹھ گیا، ہاتھ نیچے لٹکا دیئے، آنے والے آتے اور مصافحہ کرتے، آنے والے بے حد و شمار آتے مصافحہ کرتے اور کپڑے کا ٹکڑا عقیدت مندی سے پھاڑ کے لے جاتے، اس دن ڈاس کرتے یکے بعد دیگرے پہننے پڑے سب ہی پارہ پارہ ہو گئے، مجھے ان کی اس عقیدت مندی پر حیرت ہوئی کہ یہ کیسے خوش عقیدہ ہیں، جمعہ کا دن تھا میں نماز کو گیا، واپس آیا تو پھر مخلوق کا ہجوم ہو گیا، میں مصافحہ کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا اتنے میں ایک فراش نے میرا پیر پکڑ کر گھسیٹا، مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی فراس نے برجستہ کہا کہ شیخ فرید خدا کا شکر ادا کرو کہ اپنے ہی جیسے انسان پائے بوسی کے آرزو مند ہیں، مجھے اس کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اس نے خوب کہا، (واقعہ میں مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے) پھر فرمایا اے درویش جو اللہ کو پیارا ہے، وہ سب ہی کو پیارا ہے، (اسرار الاولیاء ص ۸۲-۸۳)

اس روایت میں کئی اہم نکات ہیں،

(۱) یہ اس عہد کا یعنی ۶۵۵ھ کا اہم تاریخی واقعہ ہے، جس کے پس منظر میں وہ سب کچھ ہے جس کا تعلق اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے ہے، اس باب میں اسرار الاولیاء پہلا مجموعہ

ملفوظات ہے، جو اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کی نشان دہی کرتا ہے، اور اس باب میں دیگر کتب ملفوظات پر اسے فوقیت ہے،

(۲) اس روایت سے حضرت باباصاحبؒ کی مقبولیت کے عمومی رجحان کی اور ان سے عقیدت مندی کی پوری کیفیت سے آگاہی ہو جاتی ہے، اور معاشرے کا واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے،

(۳) فراش کی بصیرت اور جسارت اور برمحل توجہ دلانا ایسا واقعہ ہے جو آپ اپنی نظیر ہے جس سے قرونِ اولیٰ کے کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو صحت مند معاشرہ کی علامت ہے.

یہ روایت فوائد الفواد (ص ۱۴۵) میں بھی ہے، اور سیر الاولیاء (ص ۹۰، ج) میں بھی ہے، بلکہ فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ایک اور روایت بھی ہے، جس میں الغ خان (غیاث الدین بلبن) کے حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے، بہرحال یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء فوائد الفواد کا ماخذ بھی ہے، اور سیر الاولیاء کا بھی، اسلوب کی سادگی و صفائی اور دلآویزی مونھ سے بول رہی ہے کہ یہ کلام حضرت باباصاحبؒ ہی کا ہے،

روایت نمبر ۱۲ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک شخص بیعت ہونے کی نیت سے دہلی سے اجودھن چلا تاکہ مجھ سے بیعت ہو، راستے میں ایک عورت سے ملاقات ہوئی، اس نے اس عورت سے دست درازی کرنی چاہی یا بات چیت کرنی چاہی اچانک ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس کے منھ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ تو کسی سے بیعت ہونے کی نیت سے جا رہا ہے، اور یہ کچھ کرنا چاہتا ہے، القصہ جب وہ شخص میرے پاس آیا تو سب سے پہلے میں نے اس سے یہی کہا کہ دیکھا اس دن اللہ پاک نے تجھے اس بلا سے کیسے محفوظ رکھا، (اسرار الاولیاء ص ۸۶)

حضرت باباصاحبؒ نے اس سے پہلے ایسے ہی ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے، وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کی نیت سے چلا تھا،

راستے میں ایک مطربہ اس پر مائل ہوئی، اتفاق سے یہ دونوں ایک گاڑی میں ہمسفر ہوئے کوئی دوسرا نہ تھا، تو اسے اس کی طرف کچھ رغبت ہوئی، کچھ دست درازی کی یا بات چیت کی، اس حالت میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص آیا، اس کے منھ پر طمانچہ مارا اور کہا کہ کس بزرگ کی خدمت میں جا رہا ہے، اور کس نیت سے جا رہا ہے اور یہ کیا ہے، جو کر رہا ہے، غرض کہ جب وہ حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا تو سب سے پہلے آپ نے یہی فرمایا اللہ پاک نے اس دن تیری بہت ہی حفاظت فرمائی، (اسرار الاولیاء ص ۸۶)

الغرض جو روایت حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے متعلق ہے، وہ فوائد الفواد (ص ۲۲۰ مطبوعہ مطبع نولکشور) میں بھی ہے، لیکن بعض تفصیلات جو اس شخص سے متعلق ہیں اور جو حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں بیعت و ارادت کی نیت سے چلا تھا، وہ بھی حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے سے متعلق ملتی ہیں، اس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ فوائد الفواد کسی ناقص نسخے سے منقول ہے، اور کسی کاتب و ناقل نے دونوں روایتوں کی معلومات کو خلط ملط کر کے ایک ہی سے وابستہ کر دیا ہے، اور یہ قرین قیاس ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء ہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے، جو مستند و معتبر ہے، اس کے علاوہ حضرت باباصاحبؒ نے جو اس شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے وہ بسبیل تذکرہ زبان پر آگیا ہے، مقصود اظہار کرامت نہیں ہے بلکہ ایسے واقعات سے آگاہی کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ساریہؓ کے واقعہ پر قیاس کرنا چاہیے، جس کا تعلق بصیرت باطنی سے ہے جو بادنی توجہ حاصل ہو جاتی ہے، اس کے لیے خیر المجالس ص ۱۳۷ - ۱۳۸ کی وہ روایت ذہن نشین رکھنی چاہیے جو روغن فروش کی بیوی سے متعلق ہے،

روایت نمبر ۱۳ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور شیخ جلال الدین تبریزی قدس اللہ سرہٗ العزیز دونوں بدایوں گئے، ... ایک دن ہم دونوں

گھر کی دہلیز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دہی بیچنے والا دہی کا ہنڈا سر پر رکھے، سامنے آیا یہ دہی بیچنے والا مواسی[1] کا رہنے والا تھا، جو بدایوں کے پاس ہی ہے، اسے کہنم دکھیتر کہتے ہیں، وہاں ڈاکو بہت رہتے تھے، دہی بیچنے والا بھی ان ہی میں سے تھا، الغرض جب دہی بیچنے والے کی نظر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مبارک چہرے پر پڑی، دیکھتے ہی وہ متاثر ہوا، اور جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس کی طرف دیکھا تو کہنے لگا کہ دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے ایسے بزرگ بھی ہیں، فوراً ہی مسلمان ہوگیا۔ اس کا نام علی[2] رکھا، جب مسلمان ہوگیا تو اپنے گھر گیا، اور فوراً ہی واپس آگیا اور ایک لاکھ جیتل[3] لاکر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کیے، شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انھیں قبول فرمایا، اور فرمایا انھیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس طرح میں کہوں، اس طرح خرچ کرتے رہو، چنانچہ کسی کو سو دلاتے اور کسی کو کم وبیش مگر پانچ سے کم کسی کو نہ دلاتے تھے، تمام رقم خرچ ہوگئی، صرف ایک درہم رہ گیا، علی کہتے ہیں مجھے تردد تھا کہ پانچ سے کم تو کسی کو دلاتے نہیں اور میرے پاس اب ایک ہی درم ہے، اگر کسی کو پانچ دینے کو کہا تو میں کیا دوں گا، اتنے میں ایک مانگنے والا آیا، تو آپ نے فرمایا کہ ایک درہم اسے دیدو، علی کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر حیران رہ گیا،

. . . . (اسرار الاولیاء، ص ۹۰)

یہ روایت بھی فوائد الفواد[4] کا ماخذ ہے، | البتہ اسلوب و جزئیات میں قدرے فرق ہے، اس کا ایک سبب تو وہی ہے، جسے مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات کے زیر عنوان تفصیل سے لکھ چکا ہوں، اور

---

[1] مواسی: اس پناہ گاہ کو کہتے ہیں، اور ایسی بستی کو بھی کہتے ہیں، جس کے گرد دو گرد فصیل یا خندق ہوتی ہو،

[2] یہ بزرگ علی مولہ کے نام سے مشہور رہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کی دستار بندی کی تقریب میں شریک تھے،

[3] جیتل بہت کم قیمت کا سکہ ہوتا تھا، مگر یہاں جیتل سے مراد وہ رقم ہے، جس میں درم اور چاندی کے سکے شامل تھے،

[4] فوائد الفواد ص ۱۳۲ شہ، ماہنامہ معارف اعظم گڈھ ستمبر ۱۹۷۹ء اور فوائد الفواد ص ۱۷۲-۱۷۶-۱۲۵-۲۰۲-۵۲۱-۵۹ نیز خیر المجالس ص ۱۳۱-۱۳۷

وہ یہ کہ جب ایک ہی شخص کسی واقعہ کو یا کسی حکایت کو ایک سے زیادہ مجالس میں بیان کرتا ہے تو اسلوب وجزئیات میں فرق ہوجاتا ہے، اور جب دو مختلف شخص ایک ہی واقعہ کو بیان کریں تو اسلوب وجزئیات میں فرق ہونا فطری شے ہے،

(اسرار الاولیاء کی روایت میں حضرت بابا صاحبؒ بھی شریک ہیں، مگر فوائد الفواد (ص ۱۳۲) کی روایت میں حضرت بابا صاحبؒ کا نام نہیں ہے، اسی طرح فوائد السالکین (ص ۱۳) کی حکایت طواف کعبہ میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ دونوں بزرگ ہیں، مگر فوائد الفواد (ص) کی اسی روایت میں حضرت قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا نام ہے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کا نام نہیں ہے، اور ان بزرگ کا بھی نام نہیں ہے جن کی دونوں بزرگوں نے اتباع کی تھی، اور جن کا نام فوائد السالکین میں شیخ عثمان لکھا ہے (اور امیر شیخ عثمان گفتند)

اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ چونکہ یادداشت قلم بند نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف قوت حافظہ سے کام لیتے تھے، اور یہ بہت لائق ستائش امر ہے لیکن یہ بھی ہے کہ قوت حافظہ خواہ کتنی قوی کیوں نہ ہو، تاہم تحریری یادداشت کی نسبت حافظہ میں سہو کا زیادہ امکان ہے، اور انھیں اس کا اعتراف بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے:-

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر سہ چہار بیت
بخواند بندہ را ایں دو بیت یاد آمد
(فوائد الفواد ص ۱۵۰)

حضرت محبوب الٰہیؒ نے تین چار
شعر پڑھے تھے مجھے یہ دو ہی یاد
آئے ہیں،

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی قوت حافظہ سے متعلق استعجاب کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا:-

---

[1] ہشت بہشت نامی ترجمہ ملفوظات میں برہان الدین لکھا ہے، جو غلط ہے،

اینکہ یادمی ماند عجب است (فوائد ص ۱۶۴) یہ بات کہ سب ہی کچھ یاد رہتا ہے تعجب خیز ہے،

تعجب نہیں کہ آپ پر یہ روشن ہو کہ سہو لاحق ہوتا ہے، اور آپ نے تنہا یہ ذکر چھیڑا ہو اور اظہار استعجاب فرمایا ہو، قرینہ اسی پر دلالت کرتا ہے، بلا شبہہ حضرت محبوب الٰہیؒ مکاشف عالم بھی تھے،

الغرض فوائد الفواد کی مذکورہ روایت میں حضرت بابا صاحبؒ کا نام نامی نہ ہونا ہرگز اسکی دلیل نہیں ہے کہ آپ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ہمراہ شریک سفر نہیں تھے، یا آپ کبھی بدایوں تشریف لے ہی نہیں گئے تھے، اس لیے کہ مذکورہ وجوہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ کسی کتاب مین کسی واقعہ کا نہ ہونا اس کی دلیل نہیں کہ واقعہ کا وجود ہی نہیں ہے، میر شکار کا واقعہ اور روغن فروش کی بیوی کا واقعہ نہ فوائد الفواد میں ہے، اور نہ سیر الاولیاء میں، صرف خیر المجالس مین ہے، سلطان ناصر الدین محمود کے سفر ملتان کا اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ تاریخ طبقاتِ ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے، اور سلطان ناصر الدین محمود ہی سے منسوب ہے، مگر اسرار الاولیاء، فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ہے، تو کیا صرف اس لیے اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبقات ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے، اصول یہ ہے کہ جب راوی مستند ہوتے ہیں تو خواہ کوئی واقعہ کسی کتاب میں ہو اور کسی میں نہ ہو، اسے مستند ہی مانا جاتا ہے، حضرت بابا صاحبؒ کے سوانح کے متعلق حضرت بابا صاحبؒ سے زیادہ اور کون مستند ہو سکتا ہے، یہ کہنا یا سمجھنا کہ اگر ہوتا تو فلاں کتاب مین ضرور ہوتا، یہ لزوم مالا یلزم ہے، ممکن تو ہے، مگر ہر کسی کتاب میں ہونا لازم نہیں،

یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض امور کا ذکر ان مستند کتابوں میں ہوتا ہے، جو دستبرد زمانے سے ناپید ہو چکی ہوتی ہیں، مگر ان ہی سے مابعد کی کتابوں میں بھی منقول ہو چکا ہوتا ہے، تو اگر کتاب معتبر ہے، تو اس کی روایت کو بھی معتبر مانا جاتا ہے، تاہم تواتر بیان سے یہ ثابت ہے کہ اسرار الاولیاء مابعد کی

کتبِ ملفوظات کا ماخذ اور بدرجۂ اولیٰ افضل و معتبر ہے، اور اس میں حضرت بابا صاحبؒ کے سفر بدایوں کا ذکر بھی معتبر ہے، قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے۔

شیخ نجیب الدین متوکلؒ را برادرے بود در بداؤں، ہر سال بدیدن او آن جا رفتے،

(سیر الاولیاء ص ۱۶۰ ج)

شیخ نجیب الدین متوکلؒ حضرت بابا صاحبؒ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، جو ہر سال اپنے بھائی کی خدمت میں بدایوں تشریف لے جاتے تھے، تو کیا حضرت بابا صاحبؒ کا بدایوں تشریف لے جانا ناممکنات سے ہے، جو انکار کیا جائے، واقعاتِ متعلقہ سے اسرار الاولیاء کے بیان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے، اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر اسرار الاولیاء میں بیان کردہ مذکورہ سفر بدایوں کو تسلیم کرنا ہوتا ہے، اور انکار کی کوئی معقول وجہ متبادر نہیں ہوتی، اور یہ ماننا ہوگا کہ اگرچہ اسرار الاولیاء عقیدت مندوں کی بے اعتنائی کی بنا پر صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر منظر عام پر نہیں آسکی ہے، اور اس میں کتابت و طباعت کی بکثرت غلطیاں ہیں تاہم وہ بذات خود معتبر و مستند ہے، اور اس کا استناد حضرت بابا صاحبؒ سے صحیح اور درست ہے۔ (باقی)

امام الحرمین عبد الملک جوینی

از جناب مولوی شاہ نصر احمد صاحب پھلواروی

(۳)

امام الحرمین کے عقائد

امام الحرمین کے بارے میں صرف اس قدر کہہ دینا کافی تھا کہ وہ عقیدۃً اشعری اور مسلکاً شافعی ہیں لیکن حافظ ذہبی کے خیال میں ان کے بعض اقوال اہل حق کے نقطۂ نظر سے مختلف ہیں، اس لئے ان اقوال کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے،

امام نے اپنے وسعت مطالعہ اور علم کلام میں انہماک و اشتغال اور ذوقِ تحقیق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ

میں نے کروڑوں صفحات کا مطالعہ کیا، پھر مسلمانوں اور ان کے ظاہری علوم کو چھوڑ کر تلاش و تحقیق کے بحر مواج میں غوطہ زن ہو، میری طلب و جستجو نے مجھکو ان مسائل میں بھی غور و فکر سے باز نہیں رکھا جن کی کرید سے شریعت نے منع کیا ہے، میں پہلے تقلید و اتباع کا طوق اتار کر پوری آزادی سے غور و فکر میں مصروف رہا، لیکن اب میں اس بحر بیکراں سے نکل کر حق کے ساحل پر آگیا ہوں تم لوگ بھی اسلاف کے دین پر قائم رہو، اگر میرا انجام اہل حق کے طریق پر اور کلمۂ اخلاص لا الہ الا اللہ پر نہ ہوا تو سمجھو کہ میرے لیے ہلاکت ہے۔[1]

[1] طبقات الشافعیہ ۲۶۰/۳

ان کے اس بیان میں ان کے فکری ادوار و انقلابات کے ساتھ ہی فکری و اجتہادی خطا و لغزش کا اعتراف اور قبولِ حق کا اعلان بھی مذکور ہے، لیکن حافظ ذہبی اور بعض حنابلہ نے اسکی وجہ سے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ خالص فلسفی و منطقی تھے، عقل کو نقل پر ترجیح دیتے تھے اور کلام کے ساتھ شغف نے ان کو سلف کی روش سے دور کر دیا تھا، تاہم اخیر عمر میں وہ اس سے باز آگئے تھے۔

دراصل وہ ابتدا میں اپنے عہد کے طریق تعلیم کے اثر سے تقلیداً شافعی اور اشعری تھے لیکن مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ تقلیدی جمود ٹوٹتا گیا، اور انھوں نے بلا استثنا تمام مذاہب کا مطالعہ کیا اور اہل مذاہب سے تبادلۂ خیال کے ذریعہ انکو قریب سے سمجھنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اپنی تحقیق کی روشنی میں امام اشعری کے خیالات سے کُلّی اتفاق نہ کر سکے، اور اشعری مذہب کو جس حد تک قبول کیا وہ اپنے نظریات سے اتفاق کی بنا پر کیا، اس لئے ایک عرصہ تک جذبۂ تحقیق کی یہ وارفتگی اور آزادیِ فکر ان کی عظیم شخصیت کے لیے کوئی بدنما داغ نہیں، بلکہ ایک طرۂ امتیاز ہے، جو امام جیسے نابغۂ روزگار کے لیے مخصوص ہوتا ہے، تحقیق و تلاش کی یہ کیفیت بغداد و حجاز کے زمانۂ قیام میں تھی، حجاز میں اشعری مذہب کے بارے میں ابھی امام کو پوری طرح شرح صدر نہیں ہوا تھا کہ ایک شب خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے، ارشاد ہوا۔

علیک باعتقاد ابن الصابونیؒ　　　　ابن الصابونیؒ کے مسلک کو اختیار کرو،

شیخ الاسلام ابو عثمان صابونی (م ۴۴۹ھ) عالم متبحر اور اہم مرتاض تھے، اور سنت رسولؐ پر سختی سے پابند تھے، انھوں نے بیس سال تک جامع منیعی میں وعظ کہا، ان کے وعظ میں اسانیدہ

[1] ابن عساکر تاریخ الکبیر ۳۲/۳

کی صف کے لوگ مثلاً ابو الطیب سہل الصعلوکی، ابو اسحاق اسفرائینی، ابو بکر ابن فورک وغیرہ آتے تھے،
خراسان میں انکو شیخ الاسلام کہا جاتا تھا، فقہ میں امام شافعیؒ اور کلام میں امام اشعری کے مسلک پر تھے،

اس خواب کے بعد انھوں نے اسی مسلک کو اختیار کیا، اور پھر تو اعتدال سے بھی بڑھ گئے، چنانچہ اپنی کلامی کتابوں میں اشاعرہ کی پوری تائید کی ہے، اور فقہ میں ایک کتاب "مغیث الخلق فی اختیار الاحق" تصنیف کی جس میں شافعی مذہب کو دیگر مذاہب پر ترجیح دی،

حافظ ذہبی نے ان کے علم و فضل پر اس روایت سے نقد کیا ہے کہ امام سے کسی نے الرحمٰن علی العرش استویٰ کے معنی دریافت کیے اور وہ جواب نہ دے سکے، اس کی تفصیل یہ ہے، کہ کلام اللہ کی وہ آیتیں جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے صفات جسمانی کے الفاظ یعنی چہرہ، ہاتھ اور پیر وغیرہ کا ذکر ہے، ان کے بارے میں اشاعرہ کے خیالات مختلف ہیں، متقدمین اور خود امام اشعری کا مسلک یہ ہے کہ تنزیہ و تقدیس کے مفہوم کے ساتھ ان الفاظ کو ظاہری معنی میں رکھا جائے، اس کے معنی ظاہری ہیں لیکن کیفیت لامعلوم ہے، اس لئے اس میں غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے، اور متاخرین نے تاویل کی ہے، چونکہ ان الفاظ و صفات سے جسمانیت لازم آتی ہے، جو مخلوقات کا خاصہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بری و برتر ہے،

ان ہی آیتوں میں الرحمٰن علی العرش استویٰ بھی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جگہ متعین ہے، اور یہ مخلوق و حادث کی صفت ہے، اسی بنا پر امام غزالی اور معتزلہ نے استویٰ کا ترجمہ استیلاء (قہر و غلبہ) کیا ہے، ایک موقع پر امام الحرمین سے بھی اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا، امام نے فرمایا "کان اللہ ولا عرش" ایک زمانہ گذرا ہے، جب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات تھی اور عرش نہ تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم اور ازلی و ابدی ہے، اور اس کے ماسوا تمام چیزیں حادث ہیں، اس لیے

اس ذات قدیم کے ساتھ حادث کی نسبت کیونکر صحیح ہو سکتی ہے، اس طرح امام نے اشارۃً استیلاء کے معنی بیان کئے،

ابو جعفر ہمدانی نے اس جواب پر یہ اعتراض کیا کہ دعا کے وقت عارف کی زبان کی حرکت سے قبل اس کے دل کی توجہ اور ارادہ آسمان کی طرف کیوں ہوتا ہے، اس قلبی توجہ کا کیا جواب ہے؟ راوی کا بیان ہے کہ جب امام سے یہ سوالات کئے گئے، تو وہ لاجواب ہو گئے،[1]

علامہ سبکی کہتے ہیں کہ یہ روایت درایۃً و روایۃً محل نظر ہے، کیونکہ اس کی روایت ایسے لوگوں نے کی ہے جو علم کلام سے ناآشنائے محض ہیں، اور اس علم سے نابلد ہونے کی بنا پر ایسے کلامی مسائل ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں، ان سے روایت میں غلطی ناگزیر ہے، اور پھر علم کلام اور اشاعرہ سے مخالفت کی بنا پر ان سے صداقت و دیانت کی امید نہیں کی جا سکتی اور ابو جعفر ہمدانی کو بھی ان علوم سے کوئی نسبت نہیں اور نہ وہ محققین علماء کی صف میں ہیں، انکا اعتراض بھی بے وزن اور مہمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت جہت فوق کا خیال ایک عارف کے لیے ہرگز جائز نہیں، یہ تو جاہلوں کی صفت ہے، کہ ذکر خدا کے وقت جہات کا تصور کرتے ہیں اگر یہ جائز ہوتا تو نماز کی حالت میں آسمان کی طرف نظر کرنا اس کی ادائیگی کے لیے ضروری قرار دیا جاتا، حالانکہ یہ مصلّی کے لیے شرعاً ناجائز ہے،

امام الحرمین کے اس قول کی بنا پر کہ :-

لا تشتغلوا بالکلام فلو عرفت — تم لوگ کلام سے اشتغال نہ رکھو اگر میں
ان الکلام یبلغ بی ما بلغ ما — جانتا کہ یہ مجھکو وہاں پہنچادیگا جہاں پہنچایا
اشتغلت. — تو میں نے اس سے اشتغال نہ رکھا ہوتا.

---

[1] طبقات ۳/۲۶۲

حنابلہ نے کہا کہ انھوں نے علم کلام کی عقلی گمراہیوں اور خرابیوں کی وجہ سے دوسروں کو اس سے منع کیا، اور ایک عمر گذر جانے کے بعد خود بھی باز رہے، واقعہ یہ ہے کہ امام کی پوری زندگی علم کلام سے وابستہ رہی اس علم کو ان کی ذات سے بڑا فروغ ہوا، ان کی کلامی تصنیفات بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اخیر عمر میں وہ تصوف کی طرف مائل ہوگئے تھے، اور عقلی دلائل و براہین کے بجائے اب وہ کیفیات ومشاہدات کی منزل میں تھے، ان کا باطنی منبع علم جاری ہوگیا تھا، اس پر انھوں نے لوگوں کو بھی اس کی تلقین کی، علامہ سبکی ان اقوال کو موضوع قرار دیتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ امام کو متہم کرنے کے لیے حنابلہ نے یہ اقوال انکی طرف منسوب کیے ہیں، ان اقوال کی روایت کرنے والے ایک غیر معروف شخص ابوالحسن القیروانی ہیں، ان کے علاوہ امام کے کسی شاگرد نے اس کی روایت نہیں کی ہے[1]

مرض الموت میں امام نے یہ فرمایا کہ

اشہدوا علی انی رجعت عن	تم لوگ گواہ رہو کہ میں نے سلف کے
کل مقالۃ یخالف فیہا السلف	خلاف اپنے تمام اقوال سے رجوع کیا
وانی اموت علی مایموت علیہ	اور نیشاپور کی بوڑھیوں کے دین پر
عجائز نیسابور[2]	جان، جان آفریں کے سپرد کر رہا ہوں،

متاخرین اشاعرہ کے مسلک سے سلف کی طرف اپنے رجوع کا اعلان کیا، امام نے اپنی کتاب العقیدۃ النظامیۃ میں بھی سلف کی ہی تائید کی ہے[3]

علامہ ذہبی نے امام الحرمین کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ فقہ واصول میں تبحر کے باوجود علم حدیث سے ناواقف تھے، ذہبی کے اس نقد کی بنیاد اس پر ہے کہ امام نے اصول فقہ میں اپنی مشہور کتاب

[1] طبقات ۲۷۰/۳ [2] طبقات ۲۶۳/۳ [3] شذرات الذہب (بحوالہ رسالہ نظامیہ) ۳۶۰/۳

"البرھان" میں نے حضرت معاذؓ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت معاذؓ کو والیِ یمن بنا کر روانہ کرتے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بطور امتحان دریافت فرمایا کہ جب کوئی مقدمہ تمھارے سامنے آئے گا تو کس طرح فیصلہ کروگے؟ انھوں نے عرض کیا کتاب اللہ کے مطابق، پھر فرمایا کتاب اللہ میں صراحت نہ ہو تو کیا کروگے؟ جواب دیا سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرونگا، پھر پوچھا اگر سنت رسول میں بھی جواب نہ ہو تو؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ اسوقت اپنی رائے سے اجتہاد کرونگا، اس جواب پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسرت کا اظہار فرمایا، اور حضرت معاذؓ کے سینہ پر دست مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جو رسول کو پسند ہے، اس حدیث کے راوی حارث بن عمرو ہیں، انھوں نے حمص کے ان لوگوں سے روایت کی ہے جو حضرت معاذؓ کے صحبت یافتہ تھے، لیکن خود حارث بن عمرو محدثین کے ہاں غیر معروف ہیں، اسی طرح جن لوگوں سے انھوں نے روایت کی وہ بھی مجہول ہیں، اس حدیث کے بارے میں امام نے فرمایا ھو مدون فی الصحاح متفق علی صحتہ، امام کا پہلا جملہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اس کی ابوداؤد اور ترمذی نے تخریج کی ہے، اور یہ دونوں کتابیں صحاح میں داخل ہیں لیکن دوسرا جملہ محل نظر ہے، چونکہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث متصل نہیں ہے لیکن جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ اس کی تائید میں دوسری موقوف حدیثیں بھی ہیں جو حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم جیسے اجلۂ صحابہ سے روایت کی گئی ہیں، بیہقی نے سنن میں حضرت معاذؓ کی حدیث کے بعد ان موقوف احادیث کی بھی تخریج کی ہے، دارمی نے بھی حضرت معاذؓ کی حدیث اسی سند کے ساتھ لکھی ہے، اور تمام فقہاء مجتہدین اس حدیث پر اعتماد کرتے ہیں، اور اس کو قیاس کے ثبوت میں بیان کرتے ہیں امام نے بھی اس پر اعتماد کیا اور صحیح کہا،

امام کے علم حدیث کی تحصیل اور احادیث کی سماعت و روایت کو تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے، انھوں نے متعدد شیوخ حدیث سے حدیث کا درس لیا اُن کے علاوہ اپنے والد اور ابوبکر خبازی اور حافظ ابونعیم اصفہانی سے روایت کی ہے اور بغداد کے محدثین میں ابومحمد جوہری کے درس میں شریک ہوئے اس لئے امام کے بارے میں کہنا کہ وہ اس علم سے ناواقف تھے، انکار حقیقت ہے تاہم یہ صحیح ہے کہ اس علم میں مشاہیر شیوخ کی طرح انکو شہرت نہ ہوئی، امام کے شاگرد عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ امام فن جرح و تعدیل سے اچھی طرح واقف تھے امام کے بارے میں ان کے تلمیذ عبدالغافر کا قول زیادہ قابل اعتماد ہوگا نہ کہ دو صدی بعد کے حافظ ذہبی کا بیان، حافظ ذہبی حنبلی تھے، اور حنابلہ و شوافع کے اختلافات تعصب و تشدد کی حد تک، تاریخ کے نمایاں ابواب ہیں، تاج الدین سبکی شافعی و اشعری ہیں لیکن ذہبی کے خاص شاگرد ہیں، وہ اپنے استاذ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ذہبی سخت متعصب ہیں، وہ ہمارے استاذ ہیں، ہم پر ان کے حقوق ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا حق ان کے حق سے بڑھ کر ہے، اس لئے میں پوری صفائی کے ساتھ کہونگا کہ کسی حنفی اور شافعی کے ذکر میں ذہبی کے خیالات ہرگز قابل قبول نہیں، بلکہ ان کی کتابوں سے احناف و شوافع کے حالات نہیں لینے چاہئیں[1]

سلوک و تصوف اگر وہ ظاہری علوم میں بلند مقام رکھتے تھے، تو احسان و عرفان کی اعلیٰ پایگاہ پر گام زن تھے، ان کے خاندان کی دینداری اور تقوی و طہارت کا یہ عالم تھا کہ امام کی والدہ جو ام ولد تھیں، ان کے لیے شیخ جوینی کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ پاک و طیب رزق کے علاوہ کوئی چیز انکا جزو بدن بنے، اپنے مختصر کسب حلال سے خود اور امام کی والدہ کے لیے رزق مہیا کرتے تھے، امام کی ولادت کے بعد فرزند کے ساتھ اور زیادہ توجہ رکھی اس سلسلے میں

[1] طبقات، ۱۹۱/۴

زمانۂ شیر خوارگی کا واقعہ بیان کیا جاچکا ہے،

شیخ جوینی نے امام کی ولادت سے قبل خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو دیکھا اور ان کی طرف قدم بوسی کے لیے جھکے حضرت ابراہیمؑ نے ان کو منع کیا تو شیخ ان کی پشت کی جانب پھر گئے اور ایڑی کا بوسہ دیا، شیخ جوینیؒ نے اس کی تعبیر امام کی ولادت سے کی کہ قدم بوسی کی برکت ایسے لایق فرزند کی شکل میں حاصل ہوئی، اُس وقت کے مشاہیر صوفیہ سے امام کا بہت قریبی لگاؤ تھا، امام صاحب کے والد نے شیخ ابوطالب مکیؒ، اور ابوعبدالرحمن سلمیؒ اور سلطان ابوسعید ابوالخیر سے فیض پایا، امام کو بھی سلطان ابوسعید ابوالخیر کی مجالس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، تحصیل علم کے زمانہ میں ایک روز والد بزرگوار نے سلطان کی مجلس میں جانے کے لیے حکم دیا، اور یہ بھی کہا کہ ان سے جو باتیں ہوں ان سے مجھ کو خبر کرنا، سلطان ابوسعید نے ان سے دریافت فرمایا کیا پڑھتے ہو؟ امام نے جواب دیا "خلافیات" یہ اصطلاح میں فقہ کا وہ حصہ ہے جو ائمہ مجتہدین کے مختلف فیہ مسائل پر مشتمل ہے، یہی وہ مسائل ہیں جو مناظرے کا موضوع قرار دیئے جاتے تھے، اور دو جماعتوں میں نزاع و تصادم کا باعث بنتے تھے، ابوسعید ابوالخیرؒ نے فرمایا "خلاف بناید، خلاف بناید خلاف بناید، اتفاق باید" امام نے والد سے بیان کیا انھوں نے کہا خلافیات چھوڑو اور فقہ پڑھو[4]

شریعت و طریقت کے بارے میں شیخ ابوالقاسم قشیریؒ کے استفسار پر سلطان ابوسعید نے اپنے اس شعر میں اس کے معنی بیان کیے،

از دوست پیام آمد کاراستہ کن اینک شریعت

[1] طبقات ۲۵۹/۳ [2] الانتباہ فی ذکر سلاسل اولیاء اللہ، [3] مقدمہ طبقات الصوفیہ

[4] مقامات شیخ ابوسعید،

انیک طریقت　　ہر دل پیش آر و فضول از رہ بردار

اس کے بارے میں امام الحرمین نے فرمایا کہ انہی دو لفظوں کے لیے ہم لوگ ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں، اور تصنیف و تالیف کی محنت کرتے ہیں، لیکن سلطان ابوسعید نے اسکو ایک شعر میں ادا کر دیا۔[1] ان صلحاء امت کی مجالس و صحبت نے امام کو طریقت کے سلسلۃ الذہب میں شامل کر لیا، اور امام کے ذریعہ چار سلاسل رائج ہوئے شاذلیہ، مدنیہ غربیہ، عیدروسیہ، قشیریہ۔ عیدروسیہ کی اجازت امام کو اپنے والد شیخ جوینی سے ہے، اور قشیریہ کی اجازت والد کے واسطہ سے بھی اور براہ راست حضرت شیخ ابوالقاسم قشیری سے بھی ہے، امام غزالی دونوں سلسلوں کے مجاز امام الحرمین کے ہیں، اور اپنے شیخ ابوعلی فارمدی کے بھی تصوف میں امام کی کوئی تصنیف نہیں ہے، لیکن وہ وعظ کہتے تھے، جو تصوف کے اسرار و رموز اور صوفیہ کے واردات و کیفیات کے بیان کی وجہ سے بہت موثر ہوتے تھے، اگر وہ ترتیب دیئے جاتے تو تصوف کی امہات کتب میں اضافہ ہوتا۔

سلسلۂ مدنیہ کی کئی شاخیں ہیں، ان میں سے بلاد مغرب میں مشہور ترین مدنیہ غربیہ ہے، اور حضر موت میں عیدروسیہ، ہندوستان میں عیدروسیہ اور اس کی تمام شقیقات آئی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ "این فقیر را ارتباط بہر یکے واقع شدہ"[2]

ذوق شعری | امام عرب کے مشہور ترین قبیلہ طے کی ایک شاخ سے تھے، اس لئے عربی ان کی خاندانی زبان تھی، اس گھرانے کی زبان بہت پاکیزہ اور فصیح ترین سمجھی جاتی تھی، اس خصوصیت کے ساتھ ساتھ امام نے اپنے ذوق سلیم، ذہانت اور محنت سے علوم ادب میں وہ کمال پیدا کیا کہ اپنے وقت کے چوٹی کے ادیب اور ماہر زبان تسلیم کئے گئے،[3]

۱؎ مقامات شیخ ابوسعید ۲؎ الانتباہ فی ذکر سلاسل اولیاء اللہ ۳؎ طبقات الشافعیہ ج ۳

خطابت | انکی نثر، دلآویز اطناب اور سلاست و روانی میں بے مثال ہوتی تھی، جب تکلم ریز ہوتے تو فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرتے، ابوالحسن باخرزی جیسا شاعر جس کے کلام میں جدت فکر پائی جاتی ہے،[1] ان کا کفش بردار تھا، اصمعی ادبائے عرب میں محتاج تعارف نہیں، وہ دوسری صدی کا نقاد اور لغت و نحو کا استاد تھا، لسانیات میں اس کے خدمات گوناگوں ہیں، امام شافعیؒ اس کے اسلوب بیان کے مداح تھے،[2] خلیفہ مامون زبان کے مشکل مسائل مراسلہ کے ذریعہ اس سے حل کراتا تھا،[3] امام الحرمین کے معاصرین کا خیال ہے کہ وہ اپنے وقت کے اصمعی تھے، باخرزی ان کی خطابت کے بارے میں گویا ہے،

"خطابت کے وقت اپنی زور بیانی سے فصحائے وقت کو بند کر دیتے اور اپنی نادر معلومات اور قیمتی حقایق سے بہت سے قادر الکلام لوگوں کو خاموشی پر مجبور کر دیتے،[4]

عربیت میں اس علوئے شان کا تقاضا تھا کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہوتے لیکن انھوں نے علم عروض کی قید و بند سے خود کو آزاد رکھا اور اس طرف بہت کم توجہ کی، بلکہ اس بارے میں اس قدر محتاط تھے کہ باخرزی نے ان کے کلام کی نقل کے لئے ایک سادہ بیاض رکھی لیکن بار بار کی حاضری کے باوجود اسے اشعار کے نقل و گرفت کا موقع نہ مل سکا اور بیاض بیاض ہی رہی، تاہم ان کا خزانۂ ادب اشعار سے یکسر خالی نہیں ہے، ان کے اشعار ملتے ہیں اور اہل نظر کا اس پر اتفاق ہے کہ ان کا کلام فنی پختگی، معنوی گہرائی اور زبان و بیان کے اعتبار سے بلند ہوتا تھا، چند اشعار جو نظام الملک کی تعریف میں امام کی زبان گوہر بیان سے نکل پڑے ہیں پیش کیے جاتے ہیں،

فمازال رکب المعتفین منیخة　　لدیٰ وتلک العلیا ولازلت مقصدا

برابر حاجت مندوں کی سواریاں آپکے دولتکدہ پر آتی رہیں　　اور آپ ہمیشہ ان کی منزل مقصود بنے رہیں،

۱؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳/۲۶ ۲؎ ابن خلکان ۱/۵۱۰ ۳؎ ایضاً ۴؎ دمیۃ القصر ۱۹۶

تدین لک الشم الانوف تخضعا — ولو ان زهر الافق ابدت تمردا

بڑے بڑے مغرور آپ کے نیازمند ہیں اور اگر زمین کے کسی کونے کا کوئی پھول سرکشی دکھلائے،

لجاء تک اقطار السماء تجرها — الیک لتعفوا او لتورد ها الردا

تو آسمان کے کونے اسے کھینچ کر آپکے حضور پیش کر دیں کہ خواہ آپ اُسے معاف کریں یا موت کے گھاٹ اتار دیں

وما انا الا دوحة قد غرستها — وسقیتها حتی تمادی بها المدی

اور میں تو آپ ہی کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ایک پودا ہوں جسکو آپ نے سیراب کیا اور وہ برگ و بار لے آیا

فلما اقشعر العود منها وصوحت — اتتک باغصان لها تطلب الندی

اب جب کہ اس کا تنہ خشک ہوگیا اور ڈالیاں زرد پڑ گئی ہیں تو وہ اپنی شاخوں کو آپکی شبنم سے سیرابی کیلئے لیکر آیا ہے

تاج الدین سبکی نے عبدالملک جوینی کے دست خاص کی تحریر سے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔[1] اخیر کے دو شعر مضمون کے اعتبار سے ہرگز ان کو زیب نہیں دیتے لیکن نظام کے عدل و انصاف نظم و نسق اور علمی اشاعت کے علاوہ ان کے ساتھ اخلاص و محبت، عقیدت و نیاز کے جو اوصاف بیان کیے گئے ان کی روشنی میں یہ تحدیث نعمت اور تحریض علی الخیر ہے، نہ کہ مدح سرائی جو امام کی شان سے فروتر ہے — امام الحرمین کے یہ دو شعر طالبین علم کے لیے مشعل راہ ہیں،

اخی لن تنال العلم الا بستة — سانبئک عن تفصیلها ببیان

میرے بھائی علم چھ چیزوں کے بغیر تم کبھی حاصل نہیں کر سکتے، میں ان سب کو تفصیل سے بیان کرتا ہوں

ذکاء وحرص وافتقار وغربة — وتلقین استاذ وطول زمان[2]

ذہانت، شوق، عسرت اور غریب الوطنی — استاذ کا درس و تعلیم اور طویل زمانہ

بعض وقت انھوں نے ارتجالاً بھی شعر کہے ہیں، اپنے ایک ہونہار شاگرد ابونصر عبدالرحیم کو

[1] طبقات جدید اڈیشن، ۵/۲۰۹ [2] طبقات ۳/۲۶۴ و ۲۶۵

دیکھ کر فرماتے ہیں،

تمیس کغصن اذا ما بدا — وتبدو کشمس وترنو کریم

تم شاخ تازہ کی طرح ناز سے چلتے ہو اور طلوع آفتاب کے مانند ظاہر ہوتے ہو اور ہرن کی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہو،

معانی النجابة مجموعة — لعبد الرحیم بن عبد الکریم[1]

نجابت و شرافت کے تمام اوصاف کے جامع عبدالرحیم بن عبدالکریم ہیں،

ابن العماد نے غلطی سے امام رازی کے مندرجہ ذیل دو شعر بھی ان کی طرف منسوب کر دیئے ہیں،[2]

نہایة اقدام العقول عقال — وغایة آراء الرجال ضلال

عقل کی انتہا پیر میں باندھی جانے والی رسی ہے، فکر انسانی کی انتہا حیرت زدگی اور گمراہی ہے،

وارواحنا فی وحشة من جسومنا — وغایة دنیانا اذی ووبال

ہماری روحیں جسموں میں کشمکش کی حالت میں ہیں، ہماری دنیا کا انجام اذیت اور مصیبت ہے،

ابن قیم نے "اجتماع الجیوش الاسلامیة" میں امام رازی کی کتاب "اقسام اللذات" کے ذکر میں اور لذت عقلی کی تشریح میں امام رازی کے یہ دونوں شعر نقل کیے ہیں،[3]

علمی تبحر امام الحرمین کے عہد میں اور اس کے بعد بھی کلام، اصول اور فقہ میں ان پر فضیلت رکھنے والا کوئی شخص نہیں گذرا ہے، ان کی تحقیقات سب سے بڑھ کر ہیں، قاضی ابو سعید طبری نے کہا کہ ان کو امام الحرمین کا لقب دیا گیا لیکن حق تو یہ ہے کہ وہ علمی فضیلت اور تقدم کی وجہ سے خراسان و عراق کے بھی امام ہیں، وہ قوت حافظہ و استحضار میں بے نظیر تھے، ضخیم ترین کتابیں حفظ کر لیتے تھے، اور مطالعہ و کتب بینی ان کی فطرت و عادت ثانیہ بن گئی تھی زیادہ تر علمی مطالب کے غور و فکر میں ڈوبے رہتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ میرے خواب و خور عادت اور وقت کے

[1] طبقات ۳/۲۶۴ و ۲۶۵ ، [2] شذرات الذهب ۳/۳۶۱ [3] اجتماع الجیوش الاسلامیة ص ۱۲۰

مطابق نہیں ہوتے، دن اور رات میں جس وقت نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے سو رہتا ہوں، اسی طرح بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاتا ہوں تو کھا لیتا ہوں، اگلے متکلمین کی کتابوں سے ان کو اس درجہ شغف تھا کہ قاضی ابوبکر باقلانی کے ۱۲ ہزار صفحات اتنی بار اور اس انہماک سے مطالعہ کیے کہ پورے حفظ ہو گئے[1] لیکن اس تبحر اور وسعت کے باوصف کبھی اپنے علم پر قانع نہیں ہوئے، بلکہ رہوارِ عمر کے ساتھ شوقِ علم تیز تر ہوتا رہا، ۴۶۹ھ میں ابوالحسن علی المجاشعی آئے، ان کی تصنیف اکسیر الذہب فی صناعۃ الادب کا ان سے درس لیا، مجاشعی نے کہا کہ میں نے علم کا ایسا عاشق نہیں پایا، اس محنت و ریاضت اور بحرِ علم کی غواصی و شناوری کی وجہ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، حافظ ذہبی نے ان کے حافظہ و استحضار کے بارے میں کہا ہے،

کان من اذکیاء العالم — ان کا دنیا کے ذہینوں میں شمار ہے

واحد اوعیۃ العلم[2] — اور وہ علم کا ایک ظرف تھے،

ان کے شاگرد ابوالحسن عبد الغافر کا بیان ہے کہ ہم لوگ ان کی زبان سے عجیب و غریب علمی نکات اور ایسی ایسی عبارتیں سنتے تھے، جو ادبِ عالی کا نمونہ ہوتی تھیں اور بارہا مناظرے کے وقت ہم نے فریقِ مخالف کو لاجواب ہوتے دیکھا، ان کی مجالسِ وعظ و درس میں علماء کو مباحثے اور غور و خوض میں مشغول پایا، اور ہم لوگوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ بہت ہی مختصر ہے، ابوالحسن باخرزی نے کہا، "وہ فقہ میں اپنے وقت کے شافعی اور ادب میں اصمعی اور وعظ میں حسن بصری تھے، وہ اماموں کے پیشوا تھے، اپنی علمی شان کی وجہ سے ہر ایک پر فوقیت رکھتے تھے اور رزمگاہ کے شیروں کو زیر کر لیتے تھے، جب فقہ کی مسند پر ہوتے تو امام مزنی سے بھی بڑھ جاتے، کلامی مباحث فروع کرتے تو امام اشعری سے کم نہیں ہوتے اور جب خطبہ دیتے تو اس شان

---

[1] طبقات ۳/۲۵۵ [2] العبر فی خبر من غبر ۳/۲۹۱

خطابت سے کہ فصحائے وقت کی زبان گنگ ہو جاتی،[1] کسی شاعر نے ان کے بارے میں کہا ہے،

لم تر عینی تحت ادیم الفلک — مثل امام الحرمین الثبت عبد الملک[2]

میری آنکھ نے زیرِ فلک امام الحرمین عبد الملک جیسا معتمد فاضل نہیں دیکھا،

امام، اربابِ فضل و کمال کی نگاہوں میں

عام لوگ اگر ان کو اپنا مقتدا و پیشوا سمجھتے تھے، اور تلامذہ پروانہ وار اُن پر نثار ہوتے تھے، تو ہم رتبہ اور بزرگان ان کی مدح و توصیف کرتے تھے، بادشاہ و وزیر اور ارکانِ دولت ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتے تھے، شیخ ابو اسحٰق شیرازی ان کے بارے میں لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان امام سے فائدہ حاصل کرو، یہ اس زمانہ کی بہار ہیں، اور ان کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں،

یا مفید اہل المشرق والمغرب لقد استفاد منک الاولون والآخرون۔

اور ایک دوسرے موقع پر کہتے ہیں انت الیوم امام الائمۃ (آپ تو آج امام الائمہ ہیں)، شیخ الاسلام ابو عثمان الصابونی جو اپنی بزرگی اور عمر کے لحاظ سے ان کے اساتذہ کی صف کے ہیں، وہ ان کی علمی تقریروں اور مواعظ کو سن کر فرماتے ہیں،

صرف اللہ المکارہ عن ھذا — اللہ اس امام سے مکارہ کو پھیر دے، یہ

الامام فھو الیوم قرۃ — چشمِ اسلام کی ٹھنڈک ہیں،

عین الاسلام۔

اور حافظ ابو محمد جرجانی نے کہا کہ وہ امام وقت ہیں، نادرۂ روزگار ہیں، قوتِ حافظہ اور قدرتِ کلام میں عدیم المثال ہیں اور حضرت شیخ ابوالقاسم قشیری بھی ان کے مداح ہیں،

---

[1] دمیۃ القصر۔۔۔۔ [2] طبقات ۳/۲۵۳

غانم موصلی شاعر نے کہا۔

دعوالبس المعالی فہو ثوب على مقدار قد ابى المعالى [1]

شرف و مجد کا لباس چھوڑ دو، یہ تو ابو المعالی ہی کے قد کو زیب دیتا ہے،

اخلاق وعادات ان کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر انانیت، خود پسندی اور حب جاہ جیسے اوصاف تھے، مناظروں کی کثرت خود اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے لیکن تذکرہ نگاروں نے اخلاق وعادات کے ذیل میں جو صفات بیان کئے ہیں ان سے اس کی تائید نہیں ہوتی، ممکن ہے اوائلِ عمر میں یہ مزاج رہا ہو لیکن بعد کو انکسار اور تواضع ان کے اندر بہت نمایاں ہوگئی تھی، وہ اعلیٰ سیرت وکردار کا نمونہ تھے، ہر ایک سے انشراح اور خندہ جبینی سے ملاقات کرتے، بزرگ وخورد جو شخص ان سے ہم کلام ہوتا وہ پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتے، کسی کی گفتگو سے علمی فائدہ ہوتا تو اس کو قبول کرتے اور یہ کہتے کہ یہ بات مجھ کو فلاں سے معلوم ہوئی، اعلانِ حق اور غلط کام کی اصلاح میں بادشاہ تک کی پروا نہیں کرتے، چنانچہ سلطان کی طرف سے ایک غلط اعلان کی تردید میں انھوں نے کسی مصلحت کو راہ نہ دی، اور پھر ملک شاہ کے عین غیظ وجلال کے وقت کہا کہ مذہبی امور میں تم کو مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے، وہ اہل علم کا احترام کرتے اور ان کے کمالات کو فراخ دلی سے بیان کرتے تھے، جب شیخ شیرازی نیشاپور آئے تو امام نے احتراماً ان کی سواری کی رکاب پکڑ لی، امام بیہقی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کا ان کے ہر پیرو پر احسان ہے لیکن بیہقی کا امام شافعی پر احسان ہے کیونکہ بیہقی نے ان کے مذہب کی اشاعت کیلئے تصانیف کا انبار لگا دیا ہے، اسی طرح بیہق میں شیخ جوینی کے ایک تلمیذ مفتی احمد بن علی تھے، جو

---

[1] طبقات الشافعیہ ۳/ ۲۵۳

ابن فطیمہ کے لقب سے مشہور اور بیہق کے امام تھے، وہاں سے امام الحرمین کے پاس کوئی استفتاء آتا تو اس کو واپس کر دیتے کہ ابن فطیمہ کی موجودگی میں کسی دوسرے سے استفتاء کی ضرورت نہیں [1]، لیکن علم وتحقیق کے باب میں کسی پر صحیح نقد سے باز نہیں رہتے، وہ قلبِ خاشع رکھتے تھے، تفکر و احتسابِ نفس کرتے اور رونے لگتے، خصوصاً وعظ کہتے وقت مغلوب الحال ہو جاتے [2]،

وفات ان کو یرقان کا مرض ہو گیا تھا، کچھ دنوں کے بعد صحت ہو گئی، اس بیماری میں درس وافتا اور وعظ وتصنیف کے کام موقوف ہو گئے تھے، صحت کے بعد مدرسۂ نظامیہ آئے اور درس دیا، وعظ کہا، ان کی صحت سے عام طور پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا گیا، لیکن کس کو معلوم تھا کہ یہ چراغ سحری کا آخری سنبھالا ہے، کچھ ہی دنوں کے بعد مرض الموت میں مبتلا ہو گئے، اور بخار کا دورہ آنے لگا، اس بخار نے ان کو بے حد کمزور کر دیا، علاج سے فائدہ نظر نہیں آیا تو تبدیلِ آب وہوا کے لیے بشتنقان گئے [3]، لیکن وہاں کے قیام میں مرض بڑھتا ہی گیا، اور ۴۷۸ھ میں ۲۵ ربیع الثانی چہارشنبہ کی شب کو بعد عشا اپنی حیات کی ۵۹ بہاریں دیکھ کر وفات پا گئے، اسی رات کو جنازہ نیشاپور لایا گیا، اس خبر کے عام ہوتے ہی سارا شہر ٹوٹ پڑا اور کہرام مچ گیا، ہر طرف آہ وبکا کی آواز تھی، ہجوم وازدحام کا یہ حال تھا کہ غسل کے وقت مکان کے اندر لیجانا دشوار ہو رہا تھا، بہت کوششوں سے ان کے صاحبزادے ابو القاسم نے نماز پڑھائی، اور اس مجسمۂ فضل وکمال کو لحد کی آغوش میں رکھ دیا گیا، اس روز نیشاپور کے در و دیوار گریہ کناں تھے، سارا شہر، بازار اور ایک ایک دوکان بند ہو گئی، کئی روز تک عام فضا سوگوار رہی، جامع منیعی کا وہ منبر جس پر وہ وعظ کہتے تھے توڑ دیا گیا اور ان کے تقریباً چار سو تلامذہ اس غم میں قلم دوات توڑ کر پورے ایک سال تک علمی خدمات چھوڑ بیٹھے،

---

[1] تاریخ بیہق ۲۵۸ [2] طبقات ۳/ صفحہ ۲۵۰ [3] یہ جگہ نیشاپور سے ایک فرسخ پر ہے اور آب وہوا کے لحاظ سے معتدل ہے، مراصد الاطلاع ۱/ ۱۵۵

شعرار نے دلدوز مرثیے کہے،[۱]

قلوب العالمین علی المعالی	وایام الوری شبہ اللیالی
اہل دنیا کے قلوب امام ابو المعالی سے وابستہ تھے، اب مخلوق کے دن شب کے مانند ہیں	
أیثمر غصن اہل الفضل یوما	وقد مات الامام ابو المعالی[۲]
کیا کسی اہل علم کی شاخ ثمر بار ہو گی	جب کہ امام ابو المعالی رحلت فرما چکے ہیں

حافظ ذہبی نے ان کے شاگردوں کے اس طریقۂ اظہار غم کے بارے میں کہا ہے، کہ یہ دور جاہلیت کا طریقہ اور عجمی رسم ہے، اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے کہ کسی کے غم میں ایک سال تک لوگ تمام کاموں سے دست کش ہو جائیں اور معطل ہو کر بیٹھ رہیں ــــ لیکن جس قدر عظیم نقصان ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اثرات بھی وسیع اور دیرپا ہوتے ہیں، ع

جو ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کرے

ایسی مثالیں اور بھی ملتی ہیں، اس سے ایک سال قبل بغداد میں جب شیخ ابو اسحٰق شیرازی کا انتقال ہوا تو نظام الملک کے لڑکے نے جو بغداد میں تھا، نظامیہ کو ایک روز کیلئے بند کر دیا اور تعزیتی جلسہ کیا، لیکن بیہق سے نظام الملک نے بیٹے کو خط لکھا کہ تم کو ایک سال تک مدرسہ بند کر دینا چاہئے تھا،[۳]

امام کی اولاد امام کے صرف ایک لڑکے ابو القاسم مظفر تھے، یہ رے میں پیدا ہوئے، اور کمسنی میں والد کے ساتھ نیشاپور آئے اور یہاں تعلیم حاصل کی، ادب، علوم قرآن اور حدیث سے خاص مناسبت تھی، صحیح بخاری کی سماعت کشمیہنی کے شاگرد حفصی سے کی اور والد سے "شامی" پڑھی، اور دوسرے علمار سے بھی تحصیل علم کیا، شافعی مسلک کے ممتاز علما میں انکا شمار رہا،

۱ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۲۵۰، ۲ ایضاً ج ۳ ص ۲۵۸ ۳ مرآۃ الجنان ۳/۱۱۹

اور لقب فخر الاسلام ہے،[۱] ابن فندق نے بیہق کے اہم تاریخی واقعات کے ذیل میں ایک مذہبی شورش کا ذکر کیا ہے کہ نیشاپور میں ۴۸۹ھ میں کرامیہ اور دوسرے فرقوں میں تصادم ہوا، اُن میں احناف اور شوافع بھی تھے، احناف کے قائد قاضی ابو سعید محمد ابن الصاعد تھے، اور شوافع کے سرخیل فخر الاسلام ابو القاسم مظفر تھے، ان لوگوں کی مدد کے لیے بیہق سے ایک جماعت آئی تھی۔[۲]

ابو القاسم کی وفات کے بارے میں کئی بیانات ہیں، ابن العماد نے لکھا ہے کہ ان کو باطنیوں نے شہید کیا، اور تاج الدین سبکی کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے وہ خراسان کے عمید محمد بن محمد کے ظلم و تعدی کا نشانہ بنے اور بقول عبد الغافر فارسی انکو زہر دیا گیا،[۳] بہر صورت شعبان ۴۹۳ھ میں انکا انتقال ہوا، اس واقعہ کے بعد طوس کے ابو القاسم محمد اشعری جو غالی شافعی تھے نسار جا رہے تھے، راستے میں ان کو امام کے صاحبزادے کے انتقال کی خبر ملی، اُن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ شدت غم سے انکا پتہ ٹوٹ گیا اور اسی رات میں وہ بھی جاں بحق ہوئے۔[۴]

ابو القاسم مظفر کے علاوہ ان کی کسی اولاد کا ذکر نہیں ملتا لیکن عبد الملک بن محمد بن ہبۃ اللہ البسطامی (م ۵۴۳ھ) کو سبکی نے سبط امام الحرمین الجوینی لکھا ہے،[۵] اور امام جوینی کے حالات میں لکھا ہے۔

ان اثار جدہ واجتہادہ	ان کے دینی خدمات نے ان کو زندۂ
فی دین اللہ یدوم الی یوم	جاوید کر دیا، اگرچہ ان کی نسل بیٹے
الساعۃ وان انقطع نسلہ	کی طرف سے منقطع ہو گئی۔
من جہۃ الذکور[۶]	

۱ طبقات الشافعیہ جدید اڈیشن ۵/۲۳۰ ۲ تاریخ بیہق ۲۶۸ فارسی ابو الحسن علی بن زید بیہقی معروف با بن فندق ۳ طبقات جدید اڈیشن ۵/۲۳۰ ۴ طبقات جدید ۴/۱۳ ۵ طبقات ۴/۲۶۲ ۶ طبقات ۳/۲۵۸

اس سے معلوم ہوا کہ ابوالقاسم کے ذریعہ تو نہیں لیکن ان کی لڑکی سے ان کا خاندان باقی رہا،

مولانا عبدالرزاق کانپوری مرحوم نے اپنی کتاب "نظام الملک طوسی" میں ان کے ذکر کے بعد علاء الدین عطا ملک الجوینی مصنف تاریخ جہانکشائی کو امام کا نبیرہ کہا ہے، موصوف نے غالباً مجمع الفصحاء اور مجالس المومنین کے مندرجات کے مطابق لکھا ہے، دراصل یہ محض جوینی نسبت سے اشتباہ ہوا، حافظ شمس الدین ذہبی نے تاریخ الاسلام میں علاء الدین کا نسب فضل بن ربیع تک پہونچایا ہے جو بنو عباس کا مشہور حاجب تھا۔[۱]

ممتاز تلامذہ اس آفتاب فضل و کمال سے اکتساب فیض کے بعد جو مہ و انجم سمائے علم پر ضو فگن ہوئے وہ حجۃ الاسلام امام محمد غزالی، ابوالحسن علی الطبری معروف بہ کیاہراسی، ابوالمظفر الخوافی، ابوالقاسم انصاری اور ابونصر عبدالرحیم قشیری ہیں، یہ انکے ایسے تلامذہ ہیں جن پر خود استاذ کو ناز تھا، انھوں نے ان شاگردوں کو یہ خطابات دیئے، امام غزالی کو بحر مغدق (بحر زخار) اور کیاہراسی کو اسد مخرق (شیر درندہ) اور خوافی کو نار محرق (آتش سوزاں) وہ اکثر انہی خطابات سے ان شاگردوں کو یاد کرتے تھے،

ابوالحسن علی الکیاہراسی (م ۵۰۴ھ) ان کے تلامذہ میں ابوالحسن کیاہراسی، امام غزالی کے برابر تھے، بلکہ زمانہ تحصیل میں بعض فطری و دہبی اوصاف کی بنا پر امام غزالی پر بھی فوقیت رکھتے تھے، کیا، فارسی لفظ ہے، اس کے معنی بزرگ کے ہیں،[۲] اور ہریسہ ایک خاص قسم کا کھانا ہوتا ہے، اسکو بنانے اور بیچنے والے کو ہراس کہتے ہیں، ممکن ہے ابوالحسن یہ کام کرتے رہے ہوں، اسلیے ہراسی کی نسبت سے مشہور ہوئے، یہ طبرستان سے نیشاپور آئے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد بیہق کے مدرسہ میں مدرس ہوگئے، اس کے بعد نظامیہ بغداد کی تدریسی خدمات پر مامور ہوئے، برکیارق انکا نیازمند تھا، اپنی دولت ان کے قدموں پر نثار کرتا تھا، کیاہراسی ایک عرصہ تک قاضی بھی

۱؎ مقدمہ تاریخ جہانکشائی ۲؎ طبقات ابن ہدایۃ اللہ ص ۷۸

رہے فقہ، اصول، مناظرہ ان کے خاص علوم ہیں، اور فقہی مسائل کے مصادر احادیث کے حافظ تھے، ان کو احادیث کا اتنا اچھا استحضار تھا کہ مناظرہ میں الزامی اور عقلی جواب کے بجائے براہ راست احادیث بیان کرتے تھے، انکا یہ قول مشہور ہے،

اذا جالت فرسان الاحادیث	جب شہسواران حدیث رزمگاہ
فی میادین الکفاح طارت	علم میں آجائیں تو عقلی علوم کے نامورں
رؤس المقاییس فی مہاب	ہوا کے رخ پر بھاگتے نظر آئیں۔
الریاح۔	

تاج الدین سبکی نے ان کو احد فحول العلماء و روس الائمۃ کہا ہے، اسی طرح تمام مورخین ان کے فضل و کمال کے معترف ہیں، فیاض ازل نے علمی کمالات کے ساتھ ان کو ظاہری حسن و جمال بھی عطا کیا تھا، وہ پاکیزہ شمائل، بلند آواز اور شیریں زبان تھے، امام الحرمین کے درس کے معید ثانی تھے، ان کی تصانیف میں "شفاء المسترشدین" جو علم خلافیات کی عمدہ کتاب ہے، اور نقد مفردات الامام احمد ہیں، ان کے علاوہ ایک کتاب احکام القرآن بھی ہے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ نظامیہ بغداد کی مسند پر گذرا اور اسی منصب پر ان کا انتقال ہوا، بغداد میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی کی قبر سے متصل ان کی ابدی خوابگاہ ہے، ابوالحسن دامغانی اور ابوطالب زینبی دونوں کو کیا سے معاصرانہ چشمک تھی، تدفین کے وقت یہ دونوں موجود تھے، ابوالحسن دامغانی اور ابوطالب نے فی البدیہ ایسے اشعار کہے جن میں کیا کے فضل و کمال کا اعتراف ہے،

ابونصر عبدالرحیم (م ۵۱۴ھ) حضرت شیخ ابوالقاسم قشیری کے فرزند چہارم، کمالات صوری و معنوی میں ان کے نقش ثانی تھے اور اپنے استاذ امام الحرمین کے محبوب نظر، ابونصر قشیری

اشعریت کے ویسے ہی حامی تھے، جس طرح شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی حنبلیت کے، یہی وجہ ہے کہ بغداد کی ایک مذہبی شورش مین ان کا نام جلی حروف میں ثبت ہے سنہ ۴۶۹ھ میں حج کے بعد بغداد آئے، اور نظامیہ کے منبر پر اشعری مذہب کی اس انداز سے تبلیغ کی کہ حنابلہ جو اس کے سخت مخالف تھے، برداشت نہ کر سکے اور دفعۃً نظامیہ کی پرسکون علمی فضا کشت وخون کی شورش سے بدل گئی، اس کے بعد نظام الملک نے ان کو اصفہان بلا لیا۔[1]

علم حساب میں انفرادیت کی بنا پر فرائض میں پوری مہارت رکھتے تھے علماء ان سے یہ علم سیکھتے تھے، ابو نصر کے کمال کی بڑی دلیل یہ ہے کہ امام الحرمین نے اپنی کتاب "نہایۃ المطلب فی درایۃ المذہب" کے باب الوصیت مین ان کے اقوال نقل کئے ہیں، ابو نصر کی مجلس وعظ مین شیخ شیرازی جیسے لوگ بھی شریک ہوتے تھے، اور فاسق وفاجر اپنے گناہون سے تائب ہوتے، اور کفار مشرف بہ اسلام ہوتے تھے، حجاز و بغداد کے سفر سے واپسی کے بعد شہرت و مرجعیت کے زمانہ مین بھی اپنے استاذ امام الحرمین کے دامن فیض سے لپٹے رہے،

ابو نصر کا ادبی ذوق بہت بلند تھا، پچاس ہزار اشعار ان کو حفظ تھے، علامہ تاج الدین سبکی نے ان کے اشعار نقل کئے ہیں، ابو نصر کی یادگار ایک تفسیر بھی ہے،[2]

ابو المظفر الخوافی (م ۵۰۰ھ) نیشاپور کے زیر سایہ خواف ابو المظفر کا وطن ہے اسی نسبت سے خوافی کہلاتے ہیں، ابو المظفر، ابو ابراہیم ضریر سے فقہ پڑھ کر امام الحرمین کے درس میں آئے اور اپنی اعلیٰ علمی صلاحیتوں کی بنا پر اُن سے قریب ہو گئے، اور ان کی درسگاہ کے ہونہار فرزندوں میں شمار کیے گیے، استاذ کی خاص مجلسوں میں بھی موجود رہتے، ان

---

[1] الکامل ابن اثیر ۱۰/۳۶ [2] تبیین ۱۵ طبقات ۴/۲۴۹

صحبتون مین مناظرہ مین کمال پیدا کیا اور اپنے وقت کے بڑے مناظر تسلیم کئے گئے، اسی جوہر خاص کی بنا پر ان کو وہ آتش سوزان کہتے تھے، ان کے معاصرین کا بیان ہے کہ امام غزالی جس درجہ اپنی تصنیفات میں کامیاب ہوئے، خوافی اسی طرح مناظرے میں، حافظ ذہبی نے لکھا ہے،

رفیق الغزالی وکان عجبا فی — امام غزالی کے ہم درس تھے اور مناظرے
المناظرۃ رشیق العبارۃ — مین نرالی شان رکھتے تھے، عمدہ عبارت
برع عند امام الحرمین — لکھتے تھے، امام الحرمین کے ہان علمی کمال[3]

ان کی حیات ہی مین مسند درس پر بیٹھے، علامہ محمد بن عبدالکریم شہرستانی صاحب الملل والنحل نے فقہ کی تکمیل خوافی سے کی، خوافی طوس میں ایک عرصہ تک قاضی رہے، لیکن ان کے تقوی وتدین نے اس کی اجازت نہیں دی، اور وہ منصب قضا سے مستعفی ہو گئے، ذکاوت، فطانت، اور زبان کی فصاحت جو امام کے تلامذہ کے امتیازی اوصاف ہیں، خوافی میں بھی تھے، علامہ سمعانی نے ان کے دو صاحبزادوں ابو القاسم عبداللہ اور ابو المعالی مسعود سے حدیث کی سماعت کی، نظامیہ نیشاپور کے شیوخ میں ابو المعالی مسعود کا ذکر آیا ہے،

ابو القاسم انصاری (م ۵۱۲ھ) ظاہری علوم میں امتیاز کے ساتھ باطنی فضائل کے بھی حامل تھے، امام الحرمین جیسے عبقری استاذ اور مشاہیر شیوخ سے اکتساب علم کیا، ان کے درس مین آنے سے قبل علمی اسفار سے فارغ ہو چکے تھے، ابو الحسین بن مکی اور عبدالغافر فارسی سے حدیث کا درس لیا، فقہ، اصول اور تفسیر نظامیہ نیشاپور میں تمام کی، اور شیخ ابو القاسم قشیری کی صحبت میں رہے، ورع وتقوی، اور دیانت وامانت کی وجہ سے

اپنی مادر علمی کے عظیم کتبخانہ کے افسر منتخب ہوئے، عبدالکریم شہرستانی نے علم کلام ابوالقاسم انصاری سے پڑھا امام رازی کا سلسلہ تلمذ ابوالقاسم انصاری تک پہونچتا ہے، امام رازی نے اپنے والد کے واسطہ سے کلام وعقائد کے اہم مسائل اُن سے بیان کئے ہیں، وہ اپنی تفسیر میں سورہ انعام میں ابوالقاسم کا یہ قول نقل کرتے ہیں، جو اختلافِ عقائد کے متعلق بنیادی نکتہ ہے، ابوالقاسم انصاری نے کہا۔

"اہل سنت والجماعت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت کی طرف گیا، اور معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم اور مبرا عن العیوب ہونے پر ہے اس لئے غور سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت وتقدس کے معترف ہیں، البتہ اس قدر ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی صائب الرائے ٹھہرا۔"[1]

---

[1] تفسیر کبیر سورہ انعام

تبع تابعینؒ

(حصہ دوم)

تبع تابعین حصہ اول کی اشاعت کے بعد اب اس کا دوسرا حصہ شائع ہوا ہے، اس میں امام وکیع، امام شافعی، امام حمیدی وغیرہ کے علاوہ ۴۸، صاحب تصانیف تبع تابعین رضی اللہ عنہم کے حالات اور علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

صفحات: ۵۸۶ - قیمت: ۲۰ روپے،

مرتبہ: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی،

طب کا منظوم سرمایہ

از۔ جناب حکیم سید ظل الرحمن صاحب صدر شعبہ علم الادویہ، طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

زمانہ قدیم سے نظم کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا جاتا رہا ہے، اسے نہ صرف ایک موثر اور دلنشین ذریعہ سمجھا گیا ہے، بلکہ کلام موزوں کی وجہ سے نثر کے مقابلہ میں اسے زبانی یاد رکھنا بھی آسان ہوتا ہے، اسی لئے دنیا کے تقریباً ہر ملک اور ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم کا وجود ملتا ہے۔

یونان میں آٹھویں صدی قبل مسیح سے پہلے تحریر کی ابتدا نہیں ہوئی تھی، اہم ترین واقعات اور جملہ علوم کی تفصیلات زبانی یاد رکھی جاتی تھیں، اور وہ سینہ بسینہ منتقل کی جاتی تھیں، اس لئے نظم کا سہارا ضروری تھا، جو وقائع کو محفوظ رکھنے کی بہترین شکل ہے، یونان کی ابتدائی تاریخ اسی کے سہارے لکھی گئی، سلسلہ میں ہومر کی نظموں (ایلیڈ اور اوڈیسی) کو اولیت حاصل ہے، جن کا تعلق نویں صدی قبل مسیح سے ہے، ہومر کی نظمیں یونان تاریخ کے ابتدائی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان نظموں کے مضامین کی وجہ سے ہومر کو طب کی تاریخ میں خاص مرتبہ حاصل ہے، اسی کی وجہ سے یونانی طب کے متعلق پہلی واقفیت حاصل ہوتی ہے، اس کی نظموں سے پیشہ ور طبیبوں کی طب اور سرجری کا ثبوت ملتا ہے، ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عورتیں بھی دواؤں کے بارے میں معلومات رکھتی تھیں (ایلیڈ ۱۱، ۷۴۰)، ان میں زخموں اور ان کے مابعد اثرات اور نیز علاج کا بہت صحیح بیان ہے، درد دور کرنے والی اور زخم بھرنے والی دوائیں، دافع جنون جڑی بوٹیاں (اوڈیسی ۴، ۲۲۰) برادہ فولاد کا طبی استعمال اور گن حمک

جلا کر مکان کی صفائی کا ذکر بھی ہے، (اڈیسی ۲۲، ۴۸۱) علم تشریح کی معلومات کی وسعت تقریباً ۵۰ مخصوص الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے،

ہومر کی طرح دوسرے یونانی شعراء مثلاً گورتینہ کا باشندہ یومیلوس (آٹھویں صدی قبل مسیح) اسکرا (نزد کوہ ہیلی کون) کا باشندہ ہیسائڈ (آٹھویں صدی قبل مسیح) اور ساموس کا باشندہ آسیون (غالباً ساتویں صدی قبل مسیح) بھی قابلِ توجہ ہے، ان کی شاعری سے بھی ابتدائی مورخین نے مواد حاصل کیا ہے،

مسلمان اطبا نے بھی جن کا شعر و ادب سے خاص تعلق رہا ہے، نظم کے ذریعہ طبی معلومات پیش کی ہیں، خالص فنی موضوعات کو نظم کرنا اگرچہ دشوار بات تھی لیکن عربی عہد کی ابتدا ہی سے مسائل طبیہ کو نظم کرنے کی کوشش شروع ہو گئی تھی،

شیخ الرئیس ابن سینا جہاں قانون اور دوسری اہم کتابوں کا مصنف ہے وہاں نظم میں بھی اس کی متعدد طبی کتابیں ہیں،

۱۔ الارجوزۃ فی التشریح :۔ ۹۸ اشعار پر مشتمل ہے، کتب خانہ ویٹیکن اور برٹش میوزیم میں اسکے نسخے محفوظ ہیں،

۲۔ الارجوزۃ فی المجربات فی الطب :۔ ایاصوفیہ، راغب پاشا، نور عثمانیہ، جامع استنبول، ویانا اور برٹش میوزیم میں موجود ہے،

۳۔ الارجوزۃ فی الطب :۔ اس کے متعدد نسخے اسکوریال، پیرس، برلن، بوڈلین لندن، بیروت، قاہرہ، کیمبرج، برٹش میوزیم، استنبول، پٹنہ اور رامپور میں موجود ہیں، راقم الحروف کے ذخیرہ میں اس کا ایک نفیس مخطوطہ ۔ اسوال ۱۲۱۵ھ کا مکتوبہ ہے، اس ارجوزہ کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں ابن رشد کی شرح مشہور ہے،

یہ ارجوزہ لکھنؤ سے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ابن رشد کی شرح کے ساتھ شائع ہوا ہے، اس سے قبل کلکتہ سے ۱۸۲۹ء میں یہ طبع ہو چکا تھا، حکیم عبدالعزیز بٹالوی نے جواہر النفیس کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مع شرح طبع کرایا ہے۔

۴۔ الارجوزۃ فی الطب :۔ درج بالا ارجوزہ کے علاوہ دوسرا منظومہ ہے جس میں ۱۵۱ اشعار ہیں، یہ کتب خانہ ایاصوفیہ میں محفوظ ہے، اس کا ایک ناقص نسخہ برلن میں بھی ہے، اس ارجوزہ کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اسمع جمیع وصیتی واعمل بھا فالطب مجموع بنص کلامی

۵۔ الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ :۔ کتب خانہ برلن میں ہے،

۶۔ الارجوزۃ فی الباہ :۔ رضا لائبریری رامپور، برٹش میوزیم اور کتب خانہ وہبی استنبول میں اس کے نسخے ہیں۔

۷۔ الارجوزۃ فی تدبیر القول فی الفصول الاربعۃ :۔ اس کے متعدد نسخے استنبول کے کتبخانوں اور کتب خانہ برلن اور ویٹیکن میں موجود ہیں،

اس کی ایک شرح "القول الانیس ودر النفیس علی منظومۃ الشیخ الرئیس" کے نام سے مدین بن عبد الرحمٰن الطبیب نے کی ہے، جو کتب خانہ راغب پاشا استنبول میں ہے،

۸۔ الارجوزۃ فی الوصایا الطبیۃ :۔ استعمال دوا کے مناسب اوقات کے تعین میں ہے۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

ول یوم تنزل الشمس الحمل تشرب ماء فاترا علی عجل

کتب خانہ برلن، نور عثمانیہ، سلطان احمد ثالث استنبول میں اس کے نسخے ہیں،

۹۔ الارجوزۃ اللطیفۃ فی وصایا ابقراط :۔ کتب خانہ برلن، ویٹیکن، برٹش میوزیم اور موصل میں

موجود ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے مشہور طبیب سعید بن عبدربہ کا طبی قصیدہ طب کے منظوم عربی ذخیرہ میں خاصہ کی چیز ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانبار میں اس کا ذکر کیا ہے،

سدید الدین محمود بن عمر العطار ابن رقیقہ (۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) فخر الدین ماردینی کا شاگرد اور ابن ابی اصیبعہ کا ہم عصر ہے، لطف المسائل وتحف السائل (تالیف ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء) کے نام سے حنین بن اسحق کی کتاب المسائل اور ابن سینا کی کلیات قانون کو اس نے بحر رجز میں نظم کیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب فن شاعری اور طب دونوں کا شاہکار ہے، گورنمنٹ اورنٹیل لائبریری مدراس میں اس کا مکمل نسخہ محفوظ ہے۔

ابن رقیقہ کی دوسری منظوم کتاب الفریدۃ الشاہیۃ والقصیدۃ الباہیۃ ہے جسے اس نے الملک الاشرف موسیٰ بن الملک العادل کے نام معنون کیا ہے، اس کے علاوہ فصد کے بیان میں بھی اس کا ایک قصیدہ ہے۔

علم الادویہ کی شہرہ آفاق کتاب تذکرۃ اولی الالباب کے مصنف داوٗد انطاکی (وفات ۱۰۰۵ھ) نے جہاں متعدد بلند پایہ کتابیں تصنیف کی ہیں وہاں کلیات قانون کی منظوم شرح لکھنے کی بھی اسے عزت حاصل ہے،

عربی کی طرح فارسی میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا، ہندوستان کی ابتدائی منظوم کتابوں میں طب شہابی ہے، جو نہ صرف نظم بلکہ نثر کے لحاظ سے بھی یہاں لکھی جانے والی شروع کی چند کتابوں میں ہے اس کا سنہ تصنیف ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء ہے،

حکیم شہاب الدین بن عبدالکریم کی اس کتاب کا نام شفاء المرض ہے لیکن مصنف کے نام کی رعایت سے طب شہابی کے نام سے مشہور ہوئی، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے، ۱۲۷۲ھ کی اشاعت

پیش نظر ہے، جو مطبع مسیحائی کانپور سے طبع ہوئی ہے،

مغلیہ عہد کی بے شمار طبی کتابوں میں منظوم کتابوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے، ایک ابتدائی کتاب زبدۃ الکامل عہد بابری کے حکیم شرف الدین علی یزدی کی مرتب کردہ ہے، سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں اس کا مخطوطہ ہے، اس لائبریری میں سید نور اللہ حسین کی طب فیضی بھی قابل قدر چیز ہے،

عہد بابری کی ایک اور کتاب جامع الفوائد ہے، یہ طب یوسفی کے نام سے مشہور ہے، یوسف ابن محمد بن یوسف طبیب ہروی کی یہ کتاب ۹۲۲ھ میں تحریر کی گئی ہے، اس کا شمار عام مطبوعہ کتابوں میں ہے، شرح رباعیات طب یوسفی کے نام سے اس کی شرح بھی شائع ہو چکی ہے،

طب یوسفی کے انتخاب کا ایک خطی نسخہ جو ۳۳۴ ابیات پر مشتمل ہے، راقم کے ذخیرہ میں ہے یہ انتخاب ۱۱۹۱ھ میں کیا گیا ہے،

عہد اکبری کے نامور طبیب حکیم دوائی نے ۱۰۰۴ھ میں ادویہ کے افعال وخواص پر ایک منظوم کتاب لکھی ہے، اکبر کی تجویز پر اس کا نام فوائد الانسان رکھا گیا، راقم الحروف کے پاس اس کے دو مخطوطے محفوظ ہیں، ایک مخطوطہ کی کتابت ۱۱۵۱ھ تا آخر ۱۱۵۰ھ میں مکمل ہوئی ہے، اس پر علی مظفر خان فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی" کی مہر ہے، یہ نسخہ حاذق الملک حکیم معالج خان کی ملکیت میں رہ چکا ہے اور اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں،

ایک اہم کمیاب کتاب طب صدیقی ہے، جو عہد جہانگیر ۱۰۲۴ھ میں لکھی گئی ہے، مؤلف نے اس میں ادویہ کے ہندی نام استعمال کئے ہیں، چنانچہ کہتا ہے ؎

نوشتم دوا ہائی بہ ہندی زبان   کہ حاجت بفرہنگ نبود در آں

ابوبکر صدیق ناگوری کی کتاب کا ایک نسخہ کتب خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں محفوظ ہے، ۱۰ رجب ۱۱۹۳ فصلی کو اس کی کتابت کی گئی ہے، اس کا ایک نسخہ راقم کے ذخیرہ کی بھی زینت ہے،

عالمگیر کے عہد میں شیخ احمد قنوجی نے تحفۃ الاطبار کے نام سے نظم میں قانونچہ کی شرح کی ہے، یہ ضخیم شرح ۴۲ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں اس کا مخطوطہ ہے۔ ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۱۹ھ میں بچھمی نراین نے اس کی کتابت کی ہے، مخطوطہ پر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ اودھ کی مہریں لگی ہوئی ہیں، کتب خانہ ندوۃ العلمار لکھنؤ میں اس کا ایک زیادہ قدیم نسخہ موجود ہے، جس کی کتابت ۲ محرم ۱۱۹۱ھ کو ہوئی ہے۔

ایک ضخیم منظوم طبی مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حبیب گنج ذخیرہ میں ہے، شاعر کا نام صادق بن کاظم ہے، مخطوطہ کی کتابت چرنجی لعل نے دوشنبہ ۲۶ محرم ۱۲۷۰ھ مطابق ۲ دسمبر ۱۸۵۰ء کو مکمل کی۔

بھوپال کا پرتگالی خانوادۂ طب وہاں کے مشہور فرانسیسی خاندان سے گہرے قریبی رشتہ کی وجہ سے خود بھی فرانسیسی خاندان کے نام سے مشہور رہا، اس خانوادہ میں حکیم فرانسیس ڈسلوا فطرتؔ، حکیم بتیس ڈسلوا، حکیم الیاس ڈسلوا عبرتؔ، ارسطوے زماں حکیم جواں ڈسلوا، حکیم میتھو ڈسلوا عرف حکیم بیتس (صاحب مجربات فرنگی) حکیم دون الیٹنس ڈسلوا، حکیم دون جرنی ڈسلوا، حکیم شوپر ڈسلوا مشہور طبیب گزرے ہیں، اس خاندان کے مورث اعلیٰ حکیم دون پیڈرو ڈسلوا ترچناپلی سے وارد ہند ہوئے، شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی کے کامیاب معالجہ کے صلہ میں خردمند خان کے خطاب سے نوازے گئے اور پالکی جھالردار اور منصب عطا ہوا، اس خاندان میں متعدد اطبا صاحب دیوان اور صاحب تصنیف ہوئے ہیں، اس کے ایک ممتاز فرد حکیم لوٹس ڈسلوا نے شفاء المرض کے نام سے ۱۰۶ ابواب پر مشتمل علاج امراض پر ایک منظوم کتاب تحریر کی ہے، خوش قسمتی سے خود مصنف کے قلم کا نسخہ راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے، حکیم لوٹس کا انتقال ۲ محرم ۱۳۱۵ھ کو بھوپال میں ہوا۔

فارسی کی منظوم کتابوں میں ایک دلچسپ کتاب مثنوی بدیع "باغ رزاق" (۱۳۱۱ھ) ہے جو منشی راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ نے نواب میر محبوب علی خان کے زمانہ میں حیدرآباد میں لکھی، اس میں میوہ، پھل، پھول، ساگ، سبزی، دال، گوشت اور مختلف غذاؤں کے افعال و خواص نظم کئے ہیں، یہ کتاب ۱۳۱۴ھ میں مطبع انصاری دہلی سے طبع ہوئی ہے،

ترکی میں بھی اس ذوق کو نشو ونما ملی، الارجوزۃ فی الطب از خطیب قسطنطینی، حفظ الابدان از خضر بن عمر العطوفی، ذخر العطشان از ابن العطوفی اور کنز الاشتہا اس کی بہترین مثالیں ہیں،

اس قدیم روایت کو اردو میں بڑی خوبصورتی سے برتا گیا ہے، اطبائے ہند نے فارسی کی طرح خالص طبی مضامین کو نہ صرف اردو اشعار میں ڈھالا ہے، بلکہ اس میں خوب خوب جدتیں اور رنگینیاں پیدا کی ہیں، فرس نامہ رنگین تالیف ۱۲۱۰ھ غالباً اردو کی پہلی منظوم کتاب ہے، جو بہرحال، ایک درجہ میں طب کے مخصوص شعبہ سے تعلق رکھتی ہے، یہ کتاب عرصہ ہوا طبع ہو چکی ہے،

طب شہابی کے منظوم اردو ترجمہ کے علاوہ جو صحیفہ وللہ المعروف بہ ترجمہ طب شہابی کے نام سے ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں باہتمام قاضی عبد الکریم مطبع فتح الکریم بمبئی سے طبع ہوا ہے، دوسرے متعدد اطبار کی کاوشیں بھی خراجِ تحسین کی مستحق ہیں،

اس سلسلہ کی قابل قدر کتابوں میں "طبی خالق باری" ہے، جو خسرو کی خالق باری یا قادر نامہ غالب اور قادر نامہ فروغی کے طرز پر طب کے مبتدیوں کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ہندی، فارسی اور عربی میں ادویہ کے مترادف نام پیش کرنے کے علاوہ امراض کے ناموں کی توضیح اور اصطلاحات ادویہ کی تشریح کی گئی ہے، یہ کتاب حکیم محمد حسن حاذقؔ میرٹھی اور حکیم سید محمد کرم حسین ناطقؔ تجاروی کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے، حکیم سید کرم حسین ناطقؔ نے اس کو مارچ ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا آریوردیدک، یونانی طبی کانفرنس کے بارہویں سالانہ اجلاس کے موقع پر مسیح الملک حکیم اجمل خان کی

نذر کرتے ہوئے شائع کرایا تھا، اس سے پہلے بھی اس رسالہ کی ایک اشاعت سامنے آچکی تھی، بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

گوکھرو ہندی تازی ہے خسک — فارسی خار خسک ہے بے شبہ و شک
کہتے ہیں آلو بخارا جس کو سب — بولتے اجاص ہیں اس کو عرب
بچھ کوائے جان جہاں تم وج کہو — جو سلیخہ ہے اسی کو تج کہو
آڑو ہندی فارسی شفتالو ہے — خوخ تازی جان لے اے نیک پے
عشر تازی ہندی ہے آکھ اور مدار — فارسی میں جان خرک لے ہوشیار
آنبہ ہلدی ہندی تازی دارہلد — دارچوبہ فارسی ہے جان جلد
سیوتی نسریں ہے اے باخبر — کیوڑہ کو جان کاذی اور کدر

حکیم فقیر احمد نعیم حیدرآبادی کی تالیف مقصود الادویہ میں ادویہ کے مزاج اور خواص کو سلیقہ کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، سات ابواب پر منقسم یہ کتاب زبان و بیان پر شاعر کی ماہرانہ دسترس ظاہر کرتی ہے، لیکن بطور انکسار اس نے کہا ہے، ؎

شاعری سے نہیں یہاں سروکار — محض مخصوص طب میں ہیں اشعار

اس سلسلہ زریں کی ایک انمول کڑی "اصول صحت" ہے، یہ حکیم سید محمد عتیق القادر اور حکیم سید محمد فضل الرحمن کی مساعی کا عکس جمیل ہے، انھوں نے اپنے والد گرامی فخر الاماثل حکیم حاجی قاضی سید محمد کرم حسین ناطق کی ہدایت اور رہنمائی میں ۱۹۳۳ء میں اس کی تکمیل کی تھی، اور ۱۹۳۳ء ہی میں مطبع علمی دہلی سے یہ طبع ہوئی تھی، نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

برگ نورستہ مغیلاں کے تمام — شب کو پانی میں بھگوائے نیک نام
صبح کو اس آب میں شیرہ نکال — روز یونہی تو پلا اے ذی کمال

دور ہوگا یہ مرض سوزاک کا — آزمایا ہم نے اس کو بارہا
مغز ۳ ماشہ کلتھی پیس ہمراہ عسل — صبح کو ہر روز پلا لے بے بدل
مغز کلتھی روز ایک ماشہ بڑھا — آئے جب دس تک تو پھر اسکو گھٹا
اک اک ماشہ کو کم کر روز تو — ایک تک پہنچے تو چھوڑ اے نیک خو
خاص گردہ یا مثانہ کا ہو سنگ — اس دوا سے دفع ہوگا بے درنگ

ادویہ اور معالجات کی طرح علم تشریح میں بھی حکیم سید کرم حسین ناطق کی حسب ہدایت انکے شاگرد سید محمد فرحت علی فرحت تجاروی نے موعظۃ الحکمت کے نام سے کام شروع کیا تھا، اس کتاب کی سات فصلیں علم تشریح میں تھیں اور کچھ فصلوں میں نسخہ جات نظم کئے گئے تھے، یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی اور یہ سلسلہ ناتمام رہا، اس کتاب کی پہلی قسط ماہنامہ مسیحائے زماں تجارہ ریاست الور میں جون ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی ہے، درج بالا دونوں کتابوں کے علاوہ اگر یہ تیسری کتاب بھی طبع ہو جاتی تو طب کے منظوم ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہوتا۔

تشریح فواد کے نام سے حکیم صابر گوالیاری کا بھی ایک منظوم رسالہ ہے، جو ۱۹۵۰ء میں طبع ہوا ہے،

پنجابی زبان کی کتاب "دار الشفا" کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے، جس میں کلیات معالجات اور مرکبات کو پنجابی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ نظم کیا گیا ہے، سینکڑوں اشعار پر مشتمل ۱۲۶۰ھ کی یہ تالیف مطبع محمدی لاہور سے فارسی رسم الخط میں طبع ہوئی ہے

معارف :- دار المصنفین کے کتبخانہ میں بھی مطبوعہ اور قلمی طبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے، ان میں اکثر بڑی اہم ہیں منظوم کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، لیکن جو ہیں، ان کا مندرجہ بالا مضمون میں ذکر نہیں ہے، قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں ان کا مختصر حال درج کیا جاتا ہے،

۱۔ رسالہ منظوم: یہ قلمی رسالہ شیخ بوعلی سینا کی ایک منظوم تصنیف ہے جو غالباً اس کی مشہور کتاب قانون کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے، شروع میں طب کے مفہوم اور اعمال وخواص کے متعلق ایک مختصر نثری تحریر بھی ہے، اس کے بعد منظوم حصہ فی الامور الطبیعیۃ کے زیرعنوان شروع ہوتا ہے، یہ پورا رسالہ ۴۳ ورق اور دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ ۲۵ ورقوں پر مشتمل ہے، اس میں طب کی علمی قسم کا ذکر ہے، اور دوسرے حصہ میں عملی قسم کا بیان ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت کا کہیں ذکر نہیں مل سکا البتہ سرورق پر ایک مہر ثبت ہے جس میں ۱۲۲۳ھ درج اور سید نعمت درج ہے، رسالہ خوشخط ہے، مگر کہیں کہیں کرم خوردہ ہے، اہل فن کو اس کے مطالعہ میں کوئی دشواری نہ ہوگی، زبان عربی ہے،

۲۔ کتاب لا معلوم الاسم: ۱۰۸ ورقوں کی یہ قلمی کتاب ناقص الاول والآخر ہے، اس لئے کتاب مصنف اور کاتب کسی کے نام کا علم نہ ہو سکا اور نہ سنہ کتابت کا پتہ چل سکا، اس میں مختلف عنوانات کے تحت مختلف امراض اور ان کے علاج کا منظوم بیان ہے، جو اہل فن کے لئے بہت کارآمد ہوگا، اس کی زبان فارسی ہے،

۳۔ کتاب البیزرۃ: یہ عربی کتاب دمشق کی المجمع العلمی العربی نے ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں شائع کی ہے، اس پر شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کا مقدمہ اور تعلیقات بھی ہیں، کتاب اصلاً نثر میں ہے لیکن تقریباً نصف آخر منظوم ہے، محمد کرد علی نے اس کو جس قلمی نسخہ سے ایڈٹ کیا ہے، اس کے شروع کے صفحات موجود نہ تھے، آخری حصہ کو انھوں نے الحاقی بتایا ہے، جس میں مصنف کا نام بازیار عزیز باللہ نزار فاطمی (م ۳۸۶ھ) درج تھا لیکن فاضل محقق کے خیال میں اصل مصنف کا نام ابوعبداللہ حسن بن حسین بازیار ہے، جو فاطمی خلیفہ نزار کا وزیر تھا،

اسوۂ صحابیات

اس میں ازواج مطہرات، بنات طیبات، اور اکابر صحابیات کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے سبق آموز وقعات اور ان کی علمی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مولفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

ادبیات

نعتِ رسولِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم

از پروفیسر شاہ سید معین الدین حسن، مسند نشین وخادم حضرت خواجہ غریب نواز اجمیر

زینتِ فردوسِ ایماں رُوئے زیبائے رسول
دولتِ جاویدِ عرفاں، حسنِ رعنائے رسول

دل کا ہر گوشہ، مدینہ زارِ عرفاں ہوگیا
مرحبا! اعجازِ یاشئی تولائے رسول

دیدۂ بینا، دلِ بیدار، کیفِ سرمدی
سارے گوہر تجھ پہ قرباں اے تمنائے رسول

قدسیاں، جنت بداماں، بہرِ تمکیں ساتھ ہیں
شاہدانِ نازِ دیکھی شانِ شیدائے رسول

آفتابِ حق وصدق وعدل واحسان وکرم
آئینہ دارِ صفات اللہ، سراپائے رسول

جو بھی فرمایا تو پہلے خود عمل پیرا ہوئے
ہادیانِ حق میں یہ تھی شانِ یکتائے رسول

حق کی تعلیم وعمل سے ہر نفس آباد تھا
دشمنانِ حق کو بھی ایسے نظر آئے رسول

بیکسئ شرمِ عصیاں، ملتجئِ رحم ہے
المدد! اے کوثر و تسنیم لب ہائے رسول!

شیوۂ رحمت کے قرباں مژدۂ لا تقنطوا
دل نوازِ شرمِ عصیاں ہے بایمائے رسول

حسنِ نایابِ ازل کی آرزوئے دید میں
جانبِ محشر نکل آیا ہے شیدائے رسول

ناز و اندازِ پرستارانِ الفت کیا کہوں
لب پہ لا ادم ہیں الہٰ، سر میں سودائے رسول

کعبۂ اربابِ ناز وقبلۂ اہلِ نیاز
جنتِ چشمِ محبت، بابِ اعلائے رسول

دردمندانِ محبت میں حسن کی خستگی
درخورِ لطف وکرم ہے اے تولائے رسول

نعت

از جناب وارثؔ ریاضی چمپارن

زندگیِ شوق کا حاصل مری یادِ رسولؐ
لوحِ دل سے مٹ نہیں سکتی کبھی یادِ رسولؐ

مظہرِ شانِ خدائے دوجہاں اُن کا وجود
کاشفِ اسرارِ علم و آگہی یادِ رسولؐ

باعثِ امن و امانِ زندگی اُن کا پیام
رونقِ بزمِ خلوص و راستی یادِ رسولؐ

جب ہجومِ گردشِ دوراں سے گھبراتا ہے دل
دور کر دیتی ہے ساری بے کلی یادِ رسولؐ

عشق کو پاکیزگی دی، قلب کو سوز و گداز
دے گئی ہے فکر کو سنجیدگی یادِ رسولؐ

اُن کے ذکرِ خیر سے شاداب ہے دل کا چمن
یوں بڑھا دیتی ہے لطفِ زندگی یادِ رسولؐ

مدحتِ خیر البشرؐ میری متاعِ زندگی
اور میرا مدعائے شاعری یادِ رسولؐ

رحمتِ عالمؐ کے فیضِ بے نہایت کے طفیل
بن گئی ہے میری وجہِ بے خودی یادِ رسولؐ

اے ہجومِ شوق لے چل جانبِ طیبہ مجھے
اے سرشکِ یاس! تھم جا آ گئی یادِ رسولؐ

دولتِ ایمان، غمِ عقبیٰ، اطاعت کا شعور
اور میرے رب نے وارثؔ مجھ کو دی یادِ رسولؐ

نعت

از جناب حافظؔ جبلپوری

قلبِ ذرہ ہو یا پیکرِ کائنات
باعثِ جز و کل سرورِ کائناتؐ

اسمِ پاکِ محمدؐ ... ازل تا ابد
اک یہی لفظ ہے جوہرِ کائنات

جشنِ کون و مکاں انکے ہی دم سے ہے
ورنہ کچھ بھی نہ تھا بر سرِ کائنات

عرش و فرش انکی چوکھٹ کے دریوزہ گر
اُن کی جاگیر کُل کشورِ کائنات

جسم کے خال و خد گنبدِ معرفت
آنکھ کی پتلیاں مظہرِ کائنات

مقصدِ کن تو چشمِ رسالت میں تھا
لوگ الٹتے رہے دفترِ کائنات

اُنؐ کے غم کے خریدار بن جائیے
بیچ کر کل غمِ محشرِ کائنات

قدر کیجے محمدؐ کے اصحاب کی
یہ ہیں مہر و مہ و اخترِ کائنات

کتنے پتھر تھے حافظؔ جو دل بن گئے
دیکھ کر اسوۂ سرورِ کائناتؐ

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَادِ

رسالوں کے خاص نمبر

نقد و نظر رشید نمبر ۔ مرتبہ، پروفیسر اسلوب احمد انصاری تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی صفحات ۴۱۲ قیمت سالانہ پندرہ روپئے، فی شمارہ دس روپیے، پتہ بزم اقبال، گلفشاں، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ،

ششماہی نقد و نظر نوعمر رسالہ ہے، لیکن اس نے اپنے سنجیدہ ادبی و تنقیدی مضامین کی وجہ سے معیاری اردو رسالوں کی صف میں جگہ بنالی ہے، معارف میں اس کا پہلے تعارف کرایا جاچکا ہے، یہ نمبر اردو کے مشہور انشاپرداز اور صاحب طرز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی یادگار میں شائع کیا گیا ہے، اس کے آغاز و اختتام میں خود رشید صاحب کے دو مضامین درج ہیں، ایک میں ڈاکٹر محمد اقبال رحمۃ کے متعلق ان کے دلچسپ تاثرات بیان ہوئے ہیں، اور دوسرا پروفیسر خواجہ منظور حسین سابق صدر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کے متعلق تجزیہ کیا گیا ہے، دونوں مضامین رشید صاحب کی مخصوص طرز نگارش، اچھوتے انداز بیان اور ادبی لطافت و رعنائی سے معمور ہیں، باقی سات مضامین میں رشید صاحب کے ادبی کمالات کے بعض پہلوؤں کا ذکر ہے، ز، یڈ، اے عثمانی نے رشید صاحب کی مزاح نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، سید وقار حسین نے رشید صاحب کے مخصوص اور علامتی کرداروں کی روشنی میں اُن کے کمالات نمایاں کئے ہیں، انور صدیقی نے ان کی تنقید نگاری پر اظہار خیال کیا ہے، اور سید امین اشرف نے ان کے اسلوب تحریر کے بانکپن کا ذکر کیا ہے، اس نمبر میں جناب علی جواد زیدی کا مضمون رشید صاحب کا تہذیبی شعور

اور جناب اسلوب احمد انصاری صاحب کا مقالہ رشید احمد صدیقی کی مرقع نگاری خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہیں، زیدی صاحب نے علی گڑھ تہذیب اور ہندی اسلامی تہذیب کی اچھے انداز میں وضاحت کرکے رشید صاحب کے خط و خال بیان کئے ہیں، جناب اسلوب احمد انصاری نے رشید صاحب کے مختلف خاکوں اور مرقعوں پر بحث کرکے دکھایا ہے کہ ان کے تمام مرقعے اعلیٰ اور دلکش ہیں، البتہ رشید صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو وہ مبالغہ پر مبنی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان کے تمام قارئین اس سے اتفاق کریں، آخر میں رشید صاحب پر لکھی جانے والی کتب و مضامین کے علاوہ خود ان کے مضامین و تصنیفات کے اشاریے بھی شامل ہیں، یہ نمبر اپنے متوازن مضامین کی بنا پر لایق مطالعہ اور رشید صاحب کے مختلف کمالات کا آئینہ دار ہے،

جامعہ مولانا محمد علی نمبر حصہ دوم: مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبد اللطیف اعظمی کتابت و طباعت اچھی، سائز ۲۰×۲۶، قیمت خاص نمبر ۵ روپیے، پتہ ماہنامہ جامعہ جامعہ نگر دہلی

رسالہ جامعہ (دہلی) مولانا محمد علی مرحوم پر اپنا ایک خاص نمبر اہتمام سے شائع کرچکا ہے، یہ دوسرا حصہ ہے، اس میں بھی مولانا کی دلآویز شخصیت کے رنگارنگ جلووں اور گوناگوں پہلوؤں کی مصوری کی گئی ہے، اس میں مطبوعہ مضامین بھی شامل ہیں، لیکن ان کی حیثیت قند مکرر کی ہے، علاوہ ازیں یہ مضامین اب کمیاب اور عام قارئین کی دسترس سے باہر تھے، جناب عبد اللطیف اعظمی کا یہ کارنامہ ہے کہ ان کو بڑی کوشش و محنت سے اکٹھا کرکے دستبرد سے محفوظ کردیا، مولانا محمد علی کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کا مضمون پسند کئے جانے کے لائق ہے کیونکہ یہ بہت دلچسپ اور بے تکلف انداز میں لکھا گیا ہے، اور اس سے مولانا کے بچپن، طالب علمی اور خانگی زندگی کے متعدد واقعات و حالات معلوم ہوتے ہیں، اس نمبر کی ایک اور مفید اور اہم چیز بیگم محمد علی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے گول میز کانفرنس کے زمانہ میں لندن سے اپنی بڑی صاحبزادی زہرہ خاتون کو لکھے تھے، ان سے گول میز کانفرنس کی سرگرمیوں

اور مولانا کی علالت و وفات کے متعلق بہت سی ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، ڈاکٹر احمد سجاد کے مضمون میں مولانا محمد علی کی شخصیت کے عناصر اربعہ کا ذکر ہے، ایک مضمون میں ہندوستانی سیاست میں مولانا کا حصہ دکھایا گیا ہے، قاضی عبد الغفار اور خواجہ حسن نظامی کے مضامین میں ان کی صحافت پر گفتگو کی گئی ہے، مفتی رضا انصاری نے مولانا محمد علی کے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے انکے تعلق، عقیدت اور اختلاف وغیرہ کی سرگذشت لکھی ہے، یہ سب مضامین مفید ہیں، فاضل مرتب کے شذرات کی اختتامی سطروں میں مولانا محمد علی کی سیرت، کمالات اور مقناطیسی شخصیت کا اصل جوہر پیش کر دیا گیا ہے،

مجلۃ الجامعۃ السلفیہ موتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر } مرتبہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، سائز ۸⁄۲۰×۳۰ متوسط کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ، صفحات ۳۴۸، قیمت سالانہ ۲۰ روپیے، خاص نمبر تین روپیے

پتہ ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء جامعہ سلفیہ، بنارس،

جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم بنارس) کا شمار ملک کی بڑی درسگاہوں میں ہوتا ہے، گذشتہ سال فروری میں اس کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ دعوتی و تعلیمی کانفرنس ہوئی تھی، اس میں ہندوستان کی مختلف جماعتوں اور قدیم و جدید تعلیم گاہوں کے نمایندوں کے علاوہ بعض عرب ملکوں کے ممتاز علمی و تعلیمی اشخاص شریک ہوئے تھے، امام حرم محمد بن عبد اللہ بن سبیل کی شرکت نے اجلاس کو زیادہ پرکشش بنا دیا تھا، اب جامعہ سلفیہ کے ماہنامہ عربی رسالہ نے اس خاص نمبر میں کانفرنس کی روداد شایع کی ہے، شروع میں اجلاس کے سلسلہ میں ہندوستان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، ریاض، کویت، شارقہ اور اردن کے بعض اکابر کے پیغامات، نامور شرکاء کے نام اور ان کی تقریروں کے خلاصے درج ہیں، اور آخر میں جامعہ سلفیہ کے نقشے، علمی نمائش کے خاکے، جامعہ کے آیندہ منصوبوں اور اجلاس میں منظور کی گئی تجویزوں کا ذکر ہے، اجلاس کی مناسبت سے

تقریروں میں علم و تعلیم اور دعوت و تبلیغ کی اہمیت اور فائدے بیان کئے گئے ہیں، امام حرم کی متعدد تقریروں کے علاوہ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی اور ڈاکٹر محمد عبد اللہ عجلان (امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض) کی تقریریں مفید اور موثر ہیں، ہندوستانی مقررین میں کملاپتی ترپاٹھی، ہیم وتی نندن بہوگنا، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مولانا محمد یوسف امیر جماعت اسلامی ہند اور ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر آل انڈیا مسلم لیگ وغیرہ قابل ذکر ہیں، مولانا سید ابو الحسن علی نے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ملک کے موجودہ ابتر حالات میں مسلمانوں کے داعیانہ فرائض بیان کئے ہیں، آخری حصے کے خاکوں اور نقشوں سے بنارس کی مختصر تاریخ و اہم واقعات اور ہندوستان میں تحریک اہل حدیث کی علمی، تبلیغی اور دینی سرگرمیوں کا مرقع سامنے آجاتا ہے، بعض خاکوں میں ہندوستان میں علم حدیث کے اہم مرکزوں اور ممتاز محدثین کا ذکر ہے اور بعض میں اہل حدیث کے گذشتہ اہم دینی اجتماعات، انکی موجودہ مرکزی و صوبائی شاخوں اور ہندوستان کے تمام صوبوں کا رقبہ، زبان، کل آبادی اور اُن میں مسلمانوں کی تعداد وغیرہ درج ہے، اس اعتبار سے یہ خاص نمبر ایک علمی و تاریخی دستاویز ہے، اس کو پڑھکر وہ لوگ بھی کانفرنس کی سرگرمیوں کا لطف حاصل کر سکتے ہیں، جو اس میں شریک نہیں ہو سکے تھے،

مجلہ سیفیہ یادگار اقبال ۔ نگران جناب عبد القوی دسنوی صاحب، مرتبہ حفظان احمد ہاشمی و محمد نعمان انصاری، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۹۲، مصور قیمت، درج نہیں پتہ، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج، بھوپال،

سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کی جانب سے متعدد کتابوں کے علاوہ ایک سالانہ مجلہ بھی شایع ہوتا ہے، ۱۹۸۰-۸۱ء کا مجلہ علامہ اقبال مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں ڈاکٹر صاحب کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے، اس میں محوی صدیقی کی نظم

بڑی موثر ہے، دوسرا حصہ نثری مضامین کا مجموعہ ہے، اس کی ابتدا میں ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے جاوید اقبال کے دو خطوط درج ہیں، جو ڈاکٹر صاحب کے بھوپال کے سفر کے بارے میں پروفیسر عبد القوی دسنوی صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے استفسار کے جواب میں تحریر کئے گئے ہیں، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لایق استاذ ڈاکٹر عبد الحق نے اقبال صدی تقریبات میں اقبال سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں کا اچھے انداز سے جائزہ لیا ہے، علامہ اقبال کی بعض ماخوذ نظمیں (ڈاکٹر سید حامد حسین) اقبال کی شاعری میں وطنیت کا تصور (پروفیسر سید حامد جعفری) اقبال کا تعارف عالم عرب میں (اقبال مسعود ندوی)، اقبالیات اور بھوپال (محمد نعمان خان) اچھے مضامین ہیں، دوسرے مضامین میں اقبال کے تغزل اور دوسرے اصناف کلام کی خصوصیات بیان کرکے ان کے افکار و خیالات کی وضاحت کی گئی ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر وطنیت، مارکسزم اور عورت کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا ذکر ہے، زیادہ تر مضامین سیفیہ کالج کے اساتذہ و طلبہ کے قلم سے ہیں، طلبہ کے مضامین ان کی اچھی استعداد و صلاحیت کے غماز ہیں، تیسرے حصہ میں کلام اقبال کا انتخاب ہے جو طلبہ و طالبات ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، انتخاب کے تین حصے ہیں، ایک میں گل و لالہ، دوسرے میں پرندوں اور تیسرے میں خودی سے متعلق اشعار نقل کئے گئے ہیں، شروع میں صدر شعبہ نے اپنے اداریہ میں مختلف حیثیتوں سے بھوپال سے اقبال کے تعلقات کا ذکر کیا ہے، آخر میں سیفیہ کالج کے مختلف شعبوں کی کارگذاری تحریر کی گئی ہے، یہ مجلہ نفاست و سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے، اس کے لیے جناب عبد القوی دسنوی اور ان کے معاونین تحسین کے مستحق ہیں۔

الفرقان عدیل عباسی نمبر:۔ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ..، قیمت سالانہ ۵ روپیہ، پتہ دفتر الفرقان، نیا گاؤں، نظیر آباد، لکھنؤ۔

یہ ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کا اگست و ستمبر ۱۹۷۲ء کا مشترک شمارہ ہے جو مشہور قومی و ملی کارکن اور دینی تعلیمی تحریک کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی یادگار میں شایع ہوا ہے، اس نمبر کی خاص اور اہم چیز مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کے قلم سے قاضی صاحب مرحوم کی کتاب "تحریک خلافت" کی تلخیص ہے، یہ کتاب بعض حیثیتوں سے مختلف فیہ ہو گئی ہے، اس تلخیص میں بھی اس کے بعض قابل اعتراض امور کا ذکر ہے، مگر یہ ناکافی ہے، اس کے علاوہ قاضی صاحب کی سیرت و شخصیت پر فاضل مرتب، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور قاضی صاحب کے چھوٹے بھائی مولانا شکیل عباسی ندوی کے موثر مضامین بھی ہیں، ایک مختصر مضمون ان سطروں کے راقم کا بھی معارف سے نقل کیا گیا ہے،

رگ سنگ شخصیات نمبر:۔ مرتبہ جناب فیروز بوبیہ صاحب کتابت و طباعت بہتر، سائز ۲۰×۳۰/۸، قیمت ۴ روپئے پتہ ۴۲/۸۹ کھنیا بازار کانپور،

یہ رسالہ چند برسوں سے نکل رہا ہے، اس خاص نمبر میں مختلف طبقوں کے چند ممتاز اشخاص کے فضل و کمال کا تذکرہ ہے، پہلے مذہبی اشخاص پھر شعرا کا تذکرہ ہے، اور آخر میں ادیبوں کے متعلق مضامین ہیں، ایک مضمون مشہور طبیب اسحاق بن حنین اور دوسرا لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر اور قوم و ملت کے بے لوث خادم عبد الجلیل فریدی مرحوم پر بھی ہے، جو مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی کتاب پرانے چراغ سے ماخوذ ہے، بعض اور مضامین بھی ماخوذ ہیں، مذہبی شخصیتوں میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا فخر الدین سابق شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند اور مصر کے عبد القادر عودہ شہید پر مضامین ہیں، لیکن اسی حصہ میں عبد الرزاق قریشی مرحوم از ڈاکٹر خورشید نعمانی بھی درج ہے، مضمون اچھا ہے، لیکن اس کو ادیبوں کے ضمن میں نقل کرنا چاہئے تھا، شعرا میں حسرتؔ، سیمابؔ، نوح ناروی، جگرؔ، امجد حیدرآبادی، اثرؔ لکھنوی،

احسان دانش اور شاد عارفی پر مضامین ہیں، اسی حصہ میں مولانا شبلیؒ کی اردو میں مذہبی تاریخی شاعری پر بھی ایک مضمون ہے ایک اور مضمون میں راجستھان کی موجودہ ادبی و شعری حالت کا جائزہ لیا گیا ہے، ادبائے عظام کے زیر عنوان مسعود حسن ادیب، مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر زور، پروفیسر ہارون خاں شروانی، شوکت تھانوی، ڈاکٹر مسیح الزماں اور عامر عثمانی کا تذکرہ ہے لیکن اس فہرست میں بعض ناموں کا ذکر بے محل معلوم ہوتا ہے، مضامین اوسط درجہ کے ہیں لیکن دلچسپ ہیں،

صفیر:- مرتبہ، جناب راہی فدائی صاحب کتابت و طباعت اچھی سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت، درج نہیں پتہ ادارہ 'صفیر' انجمن ترقی اردو، مدرسہ باقیات صالحات 'ویلور'،

یہ جنوبی ہند کی ایک قدیم دینی درسگاہ مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کا سالنامہ ہے، جو اس درسگاہ کے طلبہ کی انجمن ترقی اردو کی جانب سے سلیقہ مندی سے شائع کیا گیا ہے، ہمارے پیش نظر ۷۵ء اور ۷۶ء کے سالنامے ہیں جن میں وہاں کے طلبہ و اساتذہ اور قدیم فارغین کے علاوہ بعض دوسرے اہل قلم کے مضامین و منظومات ہیں، دونوں شمارے مفید اصلاحی و دینی مضامین پر مشتمل ہیں، ایک شمارہ میں بانی مدرسہ مولانا شاہ عبد الوہاب قادری اور دوسرے میں ان کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین محمد کا تذکرہ ہے، دونوں مضامین میں ان بزرگوں کے موثر حالات و واقعات درج ہیں، دونوں شماروں میں مدرسہ کی سالانہ تعلیمی رپورٹ بھی درج ہے اور ان میں وہاں کے موجودہ حالات بھی بیان کئے گئے ہیں، طلبہ کے مضامین بھی اچھے ہیں،

گلشن:- مرتبین مولانا عبد الاحد ازہری و مولانا محمد حنیف ملی سائز ۲۰×۳۰/۸، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، صفحات ۲۴۲ پتہ معہد ملت، رسول پورہ، مالیگاؤں،

معہد ملت مہاراشٹر کے صنعتی شہر مالیگاؤں کی مشہور دینی درسگاہ ہے، اس سے مالیگاؤں ہی نہیں پورا مہاراشٹر فیضیاب ہو رہا ہے، یہ اس کا سالنامہ ہے، اس میں درسگاہ کے بانی و سرپرست اور مہاراشٹر کے قدیم ملی و قومی کارکن مولانا عبد الحمید نعمانی پر متعدد مضامین درج ہیں، جن سے ان کے حالات و خدمات اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، مدرسہ کی گذشتہ کارگذاری، تعارف اور اہم خصوصیات کے متعلق بھی مضامین درج ہیں بعض منظومات میں بھی معہد ملت کی خصوصیات کا ذکر ہے، ملک و بیرون ملک کے متعدد مشاہیر اہل علم کے تاثرات علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت نقل کئے گئے ہیں، مختلف علمی، دینی اور ادبی موضوعات پر اوسط درجہ کے مضامین اور ترجمے بھی بڑی تعداد میں درج ہیں، آخر میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی ایک مفید اور پر مغز تقریر بھی شامل ہے، یہ مدرسہ کے ختم بخاری کے ایک جلسہ میں کی گئی تھی، اس میں بخاری شریف کی آخری احادیث کی موثر اور دلنشین تشریح کی گئی ہے، اس نمبر کا یہ امتیاز بھی ہے کہ اکثر مضامین معہد ملت کے اساتذہ، فضلاء اور طلبہ کے قلم سے ہیں، لیکن ابھی یہ ان کی پہلی کوشش ہے اس لئے بعض مضامین میں اطناب، تکرار، لفاظی اور خطیبانہ رنگ نمایاں ہے، تاہم اس گلشن کی چمن بندی رنگ برنگ پھولوں سے کی گئی ہے اور یہ مرتبین کی خوش ذوقی کا ثبوت ہے،

فاران جگر نمبر:- مرتبہ جناب اسماعیل احمد مینائی، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۰ چندہ سالانہ ۵۰ روپے قیمت خاص نمبر دس روپے، پتہ دفتر ماہنامہ فاران ۲/۱۶ بہادر آباد' کراچی - پاکستان -

ماہنامہ فاران کراچی ماہر القادری مرحوم کی یادگار ہے اب یہ اسماعیل مینائی کی ادارت میں نکل رہا ہے، اس خاص نمبر میں جگر مراد آبادی کے متعلق مضامین و منظومات کے علاوہ انکی بعض تحریریں اور نظمیں بھی شائع کی گئی ہیں، تسنیم مینائی کے طویل مضمون میں جگر صاحب کے تعلق سے کئی مشاعروں کا ذکر ہے اور اس سے جگر صاحب کے متعدد دلچسپ واقعات و حالات معلوم ہوتے ہیں، ایک دوسرا قابل ذکر مضمون نواب شمس الحسن بن نواب سید علی حسن کا ہے انھوں نے بھی جگر صاحب کے بعض دلچسپ واقعات سنائے ہیں، ایک مضمون جگریات کے ماہر ڈاکٹر محمد اسلام کا بھی ہے، غرض جگر صاحب پر یہ مختصر اور طویل مضامین کا اچھا مجموعہ ہے،

شیرازہ فوق نمبر:۔ مرتبہ جناب محمد احمد اندرابی، کتابی سائز، کتابت وطباعت، کاغذ بہتر، صفحات ۱۶۸، قیمت سالانہ دس روپے فی شمارہ ۲ روپے، پتہ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، لال منڈی، سری نگر، کشمیر۔

محمد الدین فوق مرحوم اردو کے مشہور ادیب، صحافی اور کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کے سرگرم مجاہد تھے، انھوں نے کشمیر، اس کی اقوام اور اشخاص کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی تھیں اور ان کے ڈاکٹر اقبال مرحوم سے بھی گوناگوں تعلقات تھے، کلچرل اکیڈمی نے فوق کی یاد میں ایک سیمینار منعقد کیا تھا، اکیڈمی کے رسالہ شیرازہ نے اس خاص نمبر میں سیمینار کے اکثر مضامین کو شایع کیا ہے، اس میں فوق کے حالات، شاعری، تاریخ نگاری اور دوسرے خدماتِ ادب نیز کشمیر کی آزادی میں ان کی جدوجہد کا تذکرہ ہے، ید اللہ سلیم ڈار کا فوق سے تصوراتی انٹرویو ایک دلچسپ مضمون ہے، اس میں انھوں نے اپنے سوالات کا جواب فوق کے شعروں سے دیا ہے، منظوم حصہ میں خود فوق کی نظمیں اور ان کی وفات پر لکھی گئی نظمیں شامل ہیں، شروع میں فوق کی تصویریں اور شیخ عبد اللہ وزیر اعلیٰ کشمیر کا پیغام اور آخر میں فوق کی تصنیفات کی فہرست ہے۔

تعمیر حیات خصوصی شمارہ:۔ مرتبین جناب نور عظیم، شمس الحق، محمود الازہار ندوی صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۰۴، قیمت ۲۵ روپے، پتہ، مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

۱۹۷۹ء دار العلوم ندوۃ العلماء کے لیے عام الحزن تھا، اس میں اس کے تین لایق اور اہم فرزندوں مولانا عبد السلام قدوائی معتمد تعلیم، مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی اور مولوی محمد اسحاق جلیس اڈیٹر تعمیر حیات نے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا، ان سب کا دار المصنفین سے تعلق بھی کم نہ تھا، خصوصاً مولانا عبد السلام تو مولانا سید سلیمان ندوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور آخر عمر میں دار المصنفین سے وابستہ ہو کر اس کے

رفقا کی علمی رہنمائی کر رہے تھے، گذشتہ برس ندوہ کے آرگن پندرہ روزہ تعمیر حیات نے تینوں کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کر کے ان کے نام نیک کو ضایع ہونے سے بچا لیا، اس کا پہلا حصہ مولانا عبد السلام مرحوم پر مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمن ناظم دار المصنفین کے مضامین بڑے اثر انگیز ہیں، ڈاکٹر مشیر الحق اور مولانا ابو العرفان ندوی کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں، دوسرے اور تیسرے حصہ میں بالترتیب مولانا محمد الحسنی اور مولوی محمد اسحاق جلیس کا ذکر خیر ہے، ان دونوں حصوں میں بھی مولانا علی میاں کے درد بھرے مضامین ہیں، ان کے علاوہ مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی اور مولانا محمد رابع کے مضامین بھی اچھے ہیں، نمبر کے مرتب مولوی نور عظیم ندوی کے تاثرات بھی پڑھنے کے لایق ہیں، اس نمبر کے اکثر مضامین فرزندانِ ندوہ کے قلم سے ہیں، لیکن دوسرے اہل قلم کے مضامین سے بھی یہ خالی نہیں ہے، اس سے تینوں حضرات کے حالات و کمالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے،

دعوت مودودی نمبر۔ مرتبہ جناب محمد مسلم صاحب تقطیع کلاں، کاغذ اخباری، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۸۰، قیمت تین روپے پچاس پیسے، پتہ دفتر دعوت ۱۲۵ سوئیوالان نئی دہلی،

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی بانی جماعت اسلامی کے انتقال کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی جماعت کے مختلف اخباروں اور رسالوں نے خاص نمبر شایع کئے تھے، یہ خاص نمبر جماعت اسلامی ہند کے ترجمان دعوت نے مولانا کی وفات کے بعد شایع کیا تھا جو جماعت کے پاکستانی و ہندوستانی اہل قلم کے علاوہ دوسرے حلقوں کے بعض ارباب قلم کی تحریروں اور نظموں پر مشتمل ہے، ایک مضمون خود مولانا کے قلم سے بھی ہے، اس کی حیثیت خود نوشت حالات کی ہے، اس کے علاوہ ان کے متوسلین وغیرہ کے انٹرویو بھی شامل ہیں، ان سے ان کی سیرت، شخصیت اور عظمت کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں، بعض اخباروں کے تراشے اور ملک و بیرون ملک کے تعزیتی پیغام بھی دیے گئے ہیں، مولانا اشخاص کے معاملہ میں بیجا غلو اور عقیدت مندی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن خود اس نمبر میں اس کی جھلک آگئی ہے۔

"ض"

مطبوعاتِ جدیدہ

پرانے چراغ حصّہ دوم مع تکملہ سینے کے داغ — مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۴۳۱، مجلد مع گردپوش، قیمت، درج نہیں، پتہ۔ مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ،

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور ومقبول کتاب "پرانے چراغ" کا دوسرا حصہ ہے، اس میں مولانا نے مختلف عنوانات کے تحت بہت دلکش انداز میں کئی مرحوم معاصرین کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں، ہر عنوان کے تحت چار شخصیتوں کی زندگی کے خط وخال نمایاں کیے ہیں، اس طرح چھ عنوانوں کے تحت یہ چوبیس ۲۴ اصحابِ علم وکمال کے سوانحی خاکے ہیں، اہل کمال ومشاہیر کی بزم میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین خان رونق افروز ہیں، پھر اُن لوگوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جن کی بزرگانہ شفقتوں سے لائق مصنف ممتع ہوتے رہے ہیں، اور یہ الحاج مفتی امین الحسینی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا محمد سلیم کیرانوی ہیں، ادیبوں اور انشاپردازوں کی انجمن مولانا عبد الماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر و ماہر القادری سے سجائی گئی ہے، علمائے کبار کی صف میں مولانا عبد الشکور فاروقی، علامہ بہجت البیطار شامی، مولانا عبد العزیز میمن اور مولانا محمد اویس نگرامی نظر افروز ہیں، ایک حصہ ان کے معاصر دوستوں کی نذر ہے، جن میں صوفی عبد الرب، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مولانا عبد السلام قدوائی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں،

آخر میں تین خاندانی عزیزوں مولانا سید ابوالخیر برقی، امۃ اللہ تسنیم، مولانا محمد الحسنی اور ایک ندوی شاگرد وعزیز مولوی اسحاق جلیس کا ذکرِ خیر ہے، اسی حصہ کا نام "سینے کے داغ" ہے، ان سب اشخاص سے مولانا کی برسوں شناسائی اور قربت رہی ہے اور انھوں نے ہر ایک کی زندگی کا مشاہدہ گہرائی سے کیا ہے، اسلئے ان کے اخاذ ذہن اور دراک طبیعت نے ایسا سراپا بیان کیا ہے کہ ان حضرات کی جیتی جاگتی اور ایسی تصویریں سامنے آگئی ہیں جن سے ناظرین خود بھی ان کے کمالات کا مشاہدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے، مولانا کی باریک بین نظر جس طرح فضائل ومحامد پر پڑی ہے اسی طرح سیرت وشخصیت کی خامیاں اور بشری کمزوریاں بھی ان سے اوجھل نہیں رہی ہیں لیکن انکی شیریں بیانی سے زہر ہلاہل بھی قند بن گیا ہے، گونی مضمون ادب وانشا کی دلفریبی و بانکپن، تحریر کی بے ساختگی و برجستگی، زبان کی روانی و سلاست، انداز بیان کی تازگی و شگفتگی اور فکر وخیال کی رعنائی و دلآویزی سے خالی نہیں، یہ پورا مجموعہ مصنف کے حسن مذاق، لطافت طبع پختہ اور رچے ہوئے ادبی ذوق کا صحیفہ بن گیا ہے، مگر اسکی طباعت غالباً عجلت میں ہوئی ہے، اسلئے کہیں کہیں تاریخوں اور سنین کی غلطیاں ہیں، مثلاً مولانا مسعود علی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں "جشن (دار المصنفین کی طلائی جبلی) کے بعد وہ آٹھ، نو مہینے اور زندہ رہے..... آخر کم شعبان ۱۳۸۵ھ (۲۶ نومبر ۱۹۶۵ء) کو بزم شبلی کی یہ شمع بھی آخری طور پر بجھ کر رہ گئی (ص ۱۱۳ و ۱۱۴) جبکہ مولانا کی وفات ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۸۶ھ مطابق ۲ اگست ۱۹۶۶ء کو ہوئی تھی اور جشن کے بعد وہ تقریباً ڈھائی برس تک زندہ رہے، ص ۲۳۱ پر دمشق یونیورسٹی میں ایک تقریر کی تاریخ ۳ جولائی اور ص ۲۳۲ پر اُسی تقریر کی تاریخ ۲۳ جولائی تحریر کی ہے، سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر تاریخ غلط ہے، بعض جگہ تاریخیں درج ہونے ہی سے رہ گئی ہیں (ص ۲۰)، مولانا عبد الباری ندوی کے بارہ میں رقمطراز ہیں "اور انکا مضمون معجزات پر جو سیرۃ النبی کے پانچویں حصہ میں شامل ہے" (ص ۱۲۳) حالانکہ یہ مضمون سیرت کے تیسرے حصہ میں ہے، مولانا نے جن حضرات کے تذکرے لکھے ہیں اُن میں سے بعض کے اپنے نام کے خطوط بھی نقل فرمائے ہیں، مگر عام قارئین کیلئے توضیح کے بغیر انکے بعض مندرجات کا سمجھنا مشکل ہے، اسلئے ان پر فٹ نوٹ ضروری تھا، ص ۲۳ پر یہ مصرعہ "میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی" نقل کیا ہے اور اسکو اقبال کا بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں، مولانا شبلیؒ نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام کے ایک خطبہ مورخہ ۵ جون ۱۸۹۹ء میں اسے اسطرح لکھا ہے، "میرے ویرانہ میں ہو جائیگی دم بھر چاندنی"، کتابت وطباعت کی غلطیوں سے قیام گاہ (ص ۱۰۳)، تعمیر (ص ۱۰۰)، سند (ص ۱۱۶)، گلی (ص ۱۲۱)، فائل (ص ۱۵۱)، تکان (ص ۲۰۴)، مذکرادر

مضمون (ص ۲۱۱) اور داعی (ص ۲۱۹) مونث ہوگئے ہیں اور مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا نام فضل الرحمٰن لکھ گیا ہے،

سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء میں اپنی عمر ۸-۹ سال بتائی ہے (ص ۱۱) لیکن سنہ ۱۹۲۵ء میں دس سال بتائی ہے (ص ۲۳) اس سے

آیندہ ان کی عمر کا سنہ تعین کرنے میں مشکل پیدا ہوگی،

مولانا علی میاں اپنی کتابوں کو بہت عمدہ اور صحیح چھپوانے کا اہتمام کرتے ہیں لیکن اپنی گوناگوں مشغولیتوں کی

وجہ سے یہ کام اپنے شاگردوں اور عزیزوں کے سپرد کر دیتے ہیں، یہ غلطیاں ان ہی کی وجہ سے ہوئی ہیں، انکی نشاندہی

کا مقصد یہ ہے کہ آیندہ اڈیشن میں ان کو درست کر دیا جائے،

ابن کثیر کمورخ (عربی) ا۔ مرتبہ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی، بڑا سائز طباعت ٹائپ صفحات

۳۰۲، قیمت چالیس روپے پتہ پبلیکیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ،

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر دمشقی آٹھویں صدی ہجری کے نامور محدث، مفسر اور مورخ تھے،

ڈاکٹر مسعود الرحمٰن خاں ندوی نے ان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے اس مقالہ

کے دو جز ہیں پہلا حافظ ابن کثیر کے حالات و کمالات کا مجموعہ ہے اور دوسرا ان کی شہرۂ آفاق تاریخی تصنیف البدایہ والنہایہ

کے جائزہ و تبصرہ پر مشتمل ہے، دونوں اجزا کی ضخامت کی وجہ سے ان کو علٰحدہ علٰحدہ دو مستقل کتابوں کی صورت میں

شایع کیا گیا ہے، پہلے جز کا معارف میں ذکر آچکا ہے، یہ دوسرا جز ہے، اس میں مورخ کی حیثیت سے ابن کثیر پر

گفتگو کی گئی ہے اس غرض سے ان کی کتاب البدایہ والنہایہ کا جائزہ دقتِ نظر سے لیا گیا ہے، یہ چار ابواب پر مشتمل ہے،

پہلا باب زیادہ اہم اور طویل ہے، اس میں مصنف نے ابن کثیر کی کتاب کے ماخذ و مصادر پر بڑی محنت سے بحث کی ہے،

البدایہ والنہایہ کے اصلاً دو حصے ہیں، پہلا حصہ ابتدائے آفرینش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے کے واقعات

و حالات کا مجموعہ اور اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے اسی لئے اس کا نام البدایہ رکھا ہے اور دوسرے میں ہجرت

نبوی سے اپنے زمانہ تک کے سنہ وار واقعات بیان کئے ہیں اور ہر طبقہ کے مشاہیر کے تراجم لکھے ہیں اور اس کا نام

النہایہ رکھا ہے، ڈاکٹر مسعود الرحمٰن نے مصادر کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں کر دی ہیں، پہلی قسم تخلیق عالم اور انبیاء کے

قصص پر مشتمل ہے، دوسری میں سیرت نبویؐ کا ذکر ہے اور تیسری میں خلافت راشدہ سے مصنف کے زمانہ تک کو شامل کیا ہے،

پھر انھوں نے البدایہ والنہایہ کے مضامین کا تجزیہ کر کے ہر قسم کے ماخذ پر علٰحدہ علٰحدہ گفتگو کی ہے، پہلی قسم کے اہم ماخذ کتب تفسیر، صحف سماوی

اور احادیث کے مجموعے بتائے ہیں اور ان پر تین فصلوں میں گفتگو کی ہے، پہلی فصل میں ان تفسیروں کا ذکر ہے جن سے البدایہ والنہایہ کی

ترتیب و تالیف میں مدد لی گئی ہے، دوسری فصل میں قرآن مجید سے پہلے کی ان آسمانی کتابوں کا تذکرہ ہے جو ابن کثیر کا ماخذ تھیں، تیسری

تیسری فصل میں صحاح، سنن، مسانید، معاجم، اطراف اور بعض شروح کو ابن کثیر کے ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، دوسری یعنی سیرت نبوی

کے ماخذ دو فصلوں میں بیان کئے گئے ہیں، پہلی میں سیر و مغازی کی کتابوں کا ذکر ہے اور دوسری میں امام بیہقی اور امام

ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے علاوہ متعدد اور کتابوں کا ذکر ہے، تیسری قسم کے اصلی اور خاص ماخذ تاریخی کتابیں ہیں اس قسم کے تین

حصے کر دئے ہیں، پہلے حصہ میں خلافت راشدہ اور اموی حکومت کے ماخذ دو فصلوں میں بیان کئے ہیں، دوسرے حصہ میں دولت

عباسیہ کے ماخذ ایک فصل میں لکھے ہیں، تیسرا حصہ دولت ممالیک بحریہ کے ماخذ کے ذکر میں ہے اسکی پہلی فصل میں اُن معاصر

تاریخوں کا تذکرہ ہے جن سے ابن کثیر نے اپنی تاریخ کے اس حصہ میں مدد لی ہے اور دوسری فصل میں غیر کتابی ماخذ یعنی ابن کثیر

کے ذاتی مشاہدات، براہ راست معلومات، سماعی واقعات، شاہی فرامین، دستاویزات اور خطوط وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے ابن کثیر

کے جن ماخذ کی نشاندہی کی ہے، اُن میں سے جو ان کو دستیاب ہو سکے ہیں انکا البدایہ والنہایہ کے حوالوں سے مقابلہ بھی کیا ہے،

اور ان پر ابن کثیر کے نقد و اعتراض کا ذکر بھی کیا ہے اور احادیث و روایات کی صحت و ضعف کے متعلق ان کے اقوال بھی نقل کئے ہیں،

اسی طرح ان ماخذ کے بارہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ ابن کثیر نے ان سے براہ راست اخذ و استفادہ کیا تھا یا بالواسطہ، اس ضمن میں انھوں نے

کہیں کہیں ابن کثیر کی تاریخ کے بعض اہم خصوصیات بھی تحریر کئے ہیں، دوسرے باب میں اس نہج کا ذکر ہے جسکو ابن کثیر نے اپنی تاریخ

میں مدنظر رکھا ہے، تیسرے باب میں انکے اسلوب تحریر اور انداز بیان کی خصوصیات دکھائی ہیں چوتھے باب میں البدایہ والنہایہ کی قدر و قیمت،

اسکی جامعیت، استناد اور حسن قبول وغیرہ کا ذکر ہے، گو مصنف نے کہیں کہیں ابن کثیر پر نقد بھی کیا ہے مگر یہ سرسری ہے، ابن کثیر

کا زمانہ اسلامی تاریخ میں بہت اہم ہے، تاتاریوں نے دنیائے اسلام کو تہہ و بالا کر دیا تھا، ابن کثیر ان واقعات کے عینی مشاہد تھے

اسلئے انکی تاریخ کا آخری حصہ اس دور کا اہم ماخذ ہے، مصنف کو اس حیثیت سے بھی انکی تاریخ کا جائزہ لینا چاہئے تھا، بعض

مباحث کا تکرار و اعادہ بھی ہے، آخر میں کئی فہرستیں دراسماء و اعلام کے اشاریے بھی دیئے ہیں،

شراب اور اس کا اسلامی موقف: مرتبہ جناب حافظ بشیر الحق قریشی ادھونی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۰، قیمت تین روپیہ پچاس پیسے، پتہ (۱) گوہر بک ڈپو، ٹرپلیکین ہائی روڈ مدراس (۲) ہندوستان بک ڈپو، جامع مسجد ادھونی (آندھرا)

شراب ام الخبائث ہے، زیر نظر کتاب میں قرآن وحدیث کے نصوص سے اس کی حرمت واضح کی گئی ہے اور عیسائی مذہب کے رو سے بھی اسے قبیح بتایا گیا ہے، مصنف نے اسلام میں شراب کی حرمت کے احکام بتدریج نازل کئے جانے کی غرض وحکمت بھی بیان کی ہے اور اس کے طبی، اقتصادی اور معاشرتی نقصانات بھی تحریر کئے ہیں اس سلسلہ میں مغربی مفکرین کے اقوال بھی نقل کئے ہیں، اور ان لوگوں کا جواب دیا ہے جو اسے بطور دوا جائز کہتے اور حیتی کا سامان سمجھتے ہیں، آخر میں اسلامی قانون میں شراب نوشی کی سزا کو بالکل مناسب اور موزوں ثابت کیا گیا ہے، یہ سنجیدہ اور مفید کتاب مطالعہ کے لائق ہے،

کاغذ کا شہر: مرتبہ ڈاکٹر ساغر اعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۷۶، مجلد مع خوبصورت گردپوش، قیمت پندرہ روپیہ، پتہ کمبائنڈ کلینک، فیض آباد روڈ، بارہ بنکی۔ یو۔ پی

ڈاکٹر ساغر اعظمی مشاعروں میں چمک دمک دکھانے کے بعد "کاغذ کا شہر" لیکر پہلی بار کتابی دنیا میں داخل ہوئے ہیں، ان کا شہر دفتی کے لوگوں سے معمور ہے یہاں طمع کاری، اداکاری، فریب اور تصنع کا چلن ہے، کتمان حق، جرم کی پردہ پوشی، بے انصافی، سفاکی، بربریت اور اہل سیاست کی بازیگری عام ہے، مروت، شرافت، ہمدردی، خلوص اور حسن سیرت ناپید ہے، صبا کے دامن میں انگارے دھک رہے ہیں اور ٹھنڈی فضاؤں اور گھنیری چھاؤں میں بھی جسم، روح اور احساس جل رہا ہے، اس ماحول نے ساغر کی شاعری میں تلخی پیدا کر دی ہے لیکن غم دوراں کا مداوا غم جاناں کو سمجھتے ہیں اسلئے حسن وعشق کے نغمے بھی کثرت سے سنائے ہیں، ان میں بیاں کی خوبی بھی ہے مگر ان کے مجموعہ میں بعض ناہمواری اور حد سے بڑھی ہوئی شوخی وبیباکی کے علاوہ بعض اور خامیاں بھی کو رکسر ہے، اگر وہ محنت، مطالعہ اور اپنی تربیت سے غافل نہ رہے تو عوامی مقبولیت کی طرح خواص کا مرکز توجہ بھی بن جائیں گے۔

"ض"

جلد ۱۲۷　　ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۱ء　　عدد ۲

مضامین

مقالات

تلخیص وتبصرہ

معارف کی سالانہ قیمت میں اضافہ

کاغذ، کتابت طباعت ہر چیز کی شدید گرانی کی وجہ سے معارف کا سالانہ زر اعانت جنوری ۱۹۸۱ء سے پندرہ روپیے کے بجائے بیس روپیہ کر دیا گیا ہے، خریداران معارف آئندہ خریداری کے لئے بیس روپے ارسال فرمائیں۔